ماہنامہ
دلیل راہ
لاہور
نومبر 2008ء ۔ ذی القعدہ 1429ھ

[illegible]

تبصرہ و تذکرہ

[illegible]

درس ہدایت

[illegible]

گلشنی و نا گلشنی

[illegible]

آرزو کرے تو آدمی مدینے کی
ہو ہی جائے گی اک دن حاضری مدینے کی

مصطفیٰ کے تلوؤں کو چوما ہے تو جی بھر کے
جھومتی ہے قسمت پر ہر گلی مدینے کی

عاشقوں سے سنتے تھے خود بھی جا کے دیکھا
زندگی مدینے کی بندگی مدینے کی

شمس اور قمر دونوں دوجہاں کو دیتے ہیں
روشنی مدینے کی چاندنی مدینے کی

آج بھی نوازے گی نسبت حرم تجھ کو
کل بھی کام آئے گی دوستی مدینے کی

گلشن محبت کے پھول مسکرائیں گے
دیکھنا ہوا جس دم چل پڑی مدینے کی

دل رہا نہ قابو میں چشم چشم تر ہو گئی
جب کسی دیوانے نے بات کی مدینے کی

بیٹھے تھے نیازی کبھی مصطفیٰ کی چوکھٹ پر
یاد آ رہی ہے پھر وہ گھڑی مدینے کی

عبدالستار نیازی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زقعرِ زندگی گوہر برآرد

آج رسم حرف نبھانے کے لئے حضرت داتا علی ہجویری قدس سرہ کے افکار گراں مایہ سے استفادہ کرنا چاہوں گا:

''اللہ تعالیٰ نے غیر مفید علم سیکھنے والوں کی مذمت فرمائی ہے۔۔۔''

وہ لوگ جو قرآن وسنت کی راہیں چھوڑ کر فنون کے بے مقصد دروازوں سے داخل ہونا ترقی تصور کرتے ہیں آج شیطان کے عالمی ایوانوں سے ابھرنے والی یہ آواز کس قدر عبرت آموز ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اوندھا ہو رہا ہے۔ اس بت کے پاش پاش ہونے میں چند مہینے رہ گئے ہیں۔ امریکہ سے فرانس تک اور ہند سے پاک تک اس کافرانہ نظام کے پجاری ہاتھ مل رہے ہیں۔ بینک خالی ہو گئے، اعتبار ختم ہو گیا، سند جاتی رہی، شاک ایکسچینج چکرا گئی، صنعتیں اجڑنے سے قریب ہو گئیں، روشن قمقمے ظلمتوں میں ڈوب گئے۔ تف ہے ملحدانہ سوچ کی جس نے لوٹا ہے پھر اسی آوارہ لونڈے سے مسیحائی چاہ رہے ہیں۔ سودی نظام اللہ سے جنگ ہے۔ قبل اس کے پلٹے جاؤ، روندے جاؤ، بکھیرے جاؤ، پٹخے جاؤ اور ادھیڑے جاؤ۔ نظام مصطفےٰ کی طرف آجاؤ۔

یارب تیرے سوا کس کی پناہ لوں۔۔۔؟؟؟

خانقاہیں، علماء، مشائخ اور خادمین علم..... الا ماشاء اللہ سب نظام مصطفےٰ کے باغی ہو گئے، شیطانی آماجگاہوں میں پناہ کی تلاش ہونے لگی۔

حضرت داتا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جس کے دل پر مہریں ثبت ہو چکی ہیں

وہ حسد اور انکار ہی کو

نعمت تصور کر بیٹھا ہے۔۔۔''

باطل کے مورچوں میں بیٹھا ہوا، فقیہہ، مولانا، علامہ، محدث اور حضرت جی اپنی اپنی مضبوط، محکم اور ناقابل شکست دلیلیں رکھتے ہیں۔ لگتا ہے کہ حسین کے ماننے والے بھی یزید کے ساتھ سمجھوتہ کر بیٹھے ہیں۔ لوگ تاریخ بنانے کے

چکر میں تاریخ پیسنے والی چکی کے پاٹ تلے بری طرح پیسے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے مولوی کو علی علی اور حسین وحسن کے نام پر غصہ آتا ہے۔

چھوٹی سی دعوت ہے سیاسی مولویو!
ہدایت قبول کرو
نظام مصطفٰے ہی سب سے بڑی سچائی ہے

حضرت ہجویری نے فرمایا:

''علم کی رونق عمل ہے اور غافل لوگوں کا قبلہ دنیا اور دولت ہے۔ جاہل کے لئے علم کا ایک مسئلہ سیکھنا، پل صراط سے ہزار بار گزرنا ہے اور فاسق کے لئے ایک مسئلہ پر عمل کرنے کی بجائے دوزخ میں رہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔۔۔''

میرے رب! تو ہی اپنے بندوں پر حقیقت کھول!!!!

اس قوم کا کیا بنے گا جس نے جنت اور دوزخ کی تعریف بھی خود کر لی اور اپنی اپنی جنت دنیا ہی میں بنا لی۔

ایمان ہے ——— تو قوم کو اس کی ضرورت نہیں
اسلام ہے ——— تو ملت اسے ہضم نہیں کر سکتی
علم ہے ——— تو پل صراط سے مشکل ہو گیا ہے
عمل ہے ——— تو جیسے دوزخ میں بسیرا کرنا

رگڑے جھگڑے، تیزیاں طراریاں، دین کے ساتھ بھی چالاکیاں، اپنے ہی مذہب کے ساتھ دھوکے، من کے تیشے، نفس کے آرے، منفعتوں کے برچھے، تربیت کی جا رہی ہے، نظام مصطفٰے کے وجود کو زخمی اور مجروح کرنے کی۔

شیطانی ہٹیوں پر بکے ہوئے
سالکین سے وہ ملنگ قلندر

بابے اچھے جو اللہ صرف اللہ ہی کو مانتے ہیں۔

حضرت داتا علی ہجویری لکھتے ہیں:

''تصوف کو صرف دعویٰ کی حد تک رکھنے والے حقائق کی معرفت سے قاصر اور بے گانہ ہیں۔ مرید لوگوں نے تو مجاہدہ اور ریاضت سے ہاتھ اٹھا کر فاسد تصورات کا نام مشاہدہ اور بصیرت رکھ لیا ہے۔۔۔''

بابا بیچ لکھتے ہیں جو مانتے نہیں وہ بے وقوف ہیں۔ ''غامدیت'' تو جامدیت کا نام ہے۔ اسے کیا معلوم غزالی کون تھا؟ رومی کے درد کی حقیقت کیا تھی اور بہاؤالحق کا خدمت وعطا کا مسلک کتنا گہرا فیض رکھتا ہے۔ اس فکر کا کام تو حکومتی وظیفے کھانا ہے۔ نظریاتی کونسل کے رواتب اور ''تعویضات'' پر ایمان بیچ دینا ہے۔ صبح شام ٹی وی کے برقی پردوں پر تھرکتے رقص دیکھنے والا حسینی فکر کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو تصوف مانتے ہیں وہ بھی صرف لفظ وحرف تک کے کہانی گو ہیں۔ خانقاہیں زر میں ڈوب گئیں، جو انگلیوں سے سورج واپس کرنے کی تاریخ رکھتے ہیں وہ حکومتی انگلیوں پر ''تصوف کانفرنسوں'' میں مگن ہو گئے۔ تصوف واللہ! نہ وہ ہے اور نہ یہ ہے۔ تصوف تو خواہشات مٹا کر کسی کی محبت میں کھو جانے کا نام ہے۔

بابا علی ہجویری فرماتے ہیں:

''وہ کام جو نفسانی خواہش سے نمٹائے جائیں اس سے برکت اٹھ جاتی ہے اور دل آہستہ آہستہ صراطِ مستقیم سے ہٹ کر غلط راہوں کا مشتاق بن جاتا ہے۔۔۔''

بابا نے کشف المحجوب میں زر پارے رقم فرمائے ہیں۔ان کی زبان درد کی ترجمان اور ان کا قلم حقیقت کا نقیب تھا۔

آپ فرماتے ہیں:

''مقصود فوت ہو جانا موت سے بھی زیادہ تلخ ہوتا ہے۔۔۔''

مقصود سے محرومی موت سے ''اشد'' ہے لیکن اس قوم کا کیا بنے گا جس کا کوئی مقصود ہو ہی نہ اور اس نے یہ ظلم بھی کر رکھا ہے کہ صدق وحق کے سرچشموں سے اعراض کر کے شیطانوں کو اپنا امام بنا لیا ہو، راہ تصوف کا مجذوبانہ ورد تو اللہ اللہ ہے۔۔۔محمد ﷺ و مصطفٰے کی نعت ہے اور علی علی کا وظیفہ ہے۔ابو بکر وفاؤں کی تاریخ میں نقش اولین ہے۔۔۔عمر احساس و ادراک کا شہر یار ہے اور عثمان حیا وعفت کا قاسم ہے۔حسن تو پھر حسن ہے لیکن ان سب کی زندگی کا حقیقی جوہر ''فقر غیور'' کی حفظ وصیانت ہے۔حسین سے آنکھ بند کر لینے والا بالآخر یزید کا ''حاشیہ نشین'' بن ہی جاتا ہے۔

اللہ اکبر بتوں کے سر پر ابراہیمی کلہاڑا مارو، نفس کو گوہر مقصود کا انعام ملے گا پھر ساری زندگی اسی کے لئے وقف رکھو۔!!!!!!

داتا علی ہجویری کے ان الفاظ نے پہلوں کو تو بڑا نوازا ہے آنے والو تم بھی ان پر کان دھر لو:

''ایسا گھر جس نے فنا ہو جانا ہے اسے آباد کرنا جہالت ہے اور ایسی حالت جو پائیدار نہ ہو اس پر اعتماد کر لینا بے وقوفی ہے اور زندگی کی چند معدود سانسوں پر دل لگا لینا غفلت ہے اور دین میں سستی کرنا نقصان ہے اس لئے کہ جو چیز مستعار ہے وہ واپس لے لی جائے گی اور جو چیز آخر کار چلی جانے والی ہے وہ ہر گز نہ رہے گی اور جس چیز کو گنا جا سکتا ہے وہ ایک دن ختم ہو جائے گی اور کاہلی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔۔۔''

سید وسند علی ہجویری زندگی کا جوہر تقسیم فرماتے ہیں:۔۔۔۔۔۔

''درویش کی خاموشی کے لئے شرط یہ ہے کہ باطل اور برائی کو دیکھ کر خاموش نہ رہے اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ بولے۔۔۔۔۔۔''

گونگے پیروں درویشوں کا کیا بنے گا جو بدیوں کے الاؤ محسوس کر کے بھی سچائی اور صدق کے لئے ایک لفظ حقیقت کا زبان سے ادا نہ کریں اور محراب نشین نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے والی آیات کو فراموش کر دیں۔ دھندے کی خطابت اور حرص وآز کی پیری مریدی اخلاق وکردار میں کیا انقلاب بپا کرے گی۔

ہم کس تصوف کی حفاظت کی بات کرتے ہیں؟

قادریت سے کیا مراد ہے؟

نقشبندیت کس سلوک کی امین ہے؟

سہروردیت کن راہوں پر گامزن کرتی ہے؟

اور

چشتیت صفا اور دلنوازی کی جو قدریں بانٹتی تھی وہ دنیا کہاں اور کدھر چلی گئی؟

ہمارے پاس تو صرف

ٹوپیاں رہ گئیں۔۔۔!

طبلے بیچ گئے۔۔۔!

سارنگیاں مسلسل کانوں میں سیسہ گھول رہی ہیں

ساز و آواز

ریا و حرص اور آز

میلے ریلے، رسمیں وسیلے

اللہ اکبر استغفر اللہ

لو ان لی بکم قوۃ

او اوی الیٰ رکن شدید

حضرت داتا علی ہجویری نے ایک جگہ خامہ فرسائی فرماتے ہوئے اظہار پر شکوہ فرمایا:

بے علم بادشاہ

بے پرہیز عالم

اور

بے توکل فقیر

پوری مخلوق کا بگاڑ انہی تین طبقوں کے بگاڑ سے وابستہ ہے۔۔۔۔"

حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من استویٰ یوماہ فھو مغبون

جس شخص کے دو دن برابر ہوں وہ خسارے میں ہے۔

کوشش کرو کہ تمہاری زندگی میں آنے والا ہر دن گزرے ہوئے دن سے اظہار ایمان اور عمل صالح، اخلاق عالیہ اور خدمت خلق میں بہتر ہو۔

اے اللہ خوبصورت زندگی کی روحانی سوغات عطا فرما۔

سید ریاض حسین شاہ

سید ریاض حسین شاہ

حرف حرف روشنی

سید ریاض حسین شاہ قرآن مجید و فرقان حمید کی تفسیر "تبصرہ" کے عنوان سے تحریر کر رہے ہیں۔ ان کا اسلوب نگارش منفرد اور دیگر مفسرین سے مختلف بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ انداز بیان سادہ اور دلکش ہے جس میں رموز و معانی کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے سورہ فیل کی تفسیر پیش کر رہے ہیں (ادارہ)

سید ریاض حسین شاہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ
عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ
سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵

کیا آپ نے مشاہدہ نہیں فرمایا کہ کیسا کیا آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ (۱) کیا اُس نے اُن کے مکر و فریب کو بے اثر نہیں کر دیا (۲) اور اُن پر ہر سمت سے پرندوں کے ڈاروں کے ڈار بھیج دیئے (۳) جو اُن پر نوکیلی تیز دھار کنکریاں پھینکتے تھے (۴) یوں انہیں اس نے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا کر رکھ دیا (۵)

بیت اللہ کی مرکزیت کا سر دروں آشکار کرنے کے لئے حضور انور ﷺ کے مبارک سینہ پر مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی پانچ آیات بیس کلمات اور چھیانوے حروف ہیں۔

سورہ فیل کے تعارف میں عام مفسرین نے یہی لکھا کہ حضور ﷺ کی مکی زندگی کے اوائل دور میں اس سورت کا نزول ہوا لیکن سورۃ کے مضامین اور مطالب بتاتے ہیں کہ قرآن حکیم کا یہ "معجز کلام" ان ایام میں حضور ﷺ کے مبارک دل پر نازل ہوا جب آپ ہجرت فرما رہے تھے۔ بات کعبہ کی پاسبانی سے تو تعلق رکھتی ہی ہے لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً پچپن دن بعد رونما ہوا اس کا تعلق سیرت رسول عربی اور تحریک اسلام سے کیا تھا۔ ہمارے نزدیک سورت کا عمود یہ ہے کہ لوگ باور کرلیں کہ بیت اللہ کی آبادی بتوں اور بت پرستوں سے نہیں اور شر اور شرارت کے علمبردار کبھی تولیت کعبہ کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ جس گھر کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا اس کی آبادی کا راز ان کے مخلص تمنا کی آبیاری ہی ہو سکتی ہے۔ سورہ فیل دراصل اعلان تھا کہ کعبہ کا جو راز اور اعجاز ولادت نبوی کے موقع پر چشم عالم نے دیکھا تھا وہ نبی آج جب مبعوث ہو چکا ہے اس کی دعوت کے سامنے ہٹ دھرمی، ضد اور غرور کیا قدرت خداوندی سے ابا اور انکار نہیں؟ عرب کے مستکبرین کو سمجھنا چاہیئے جس خدا نے کل پتھروں کی بارش برسا کر چھوٹے چھوٹے پرندوں کی فوج سے ابرہہ ایسے جابر لوگوں کو ذلیل کر دیا تھا آج عرب کے صحراؤں میں بسنے والے بادیہ نشین اس کی قدرت کو عاجز نہیں کر سکتے۔

سورہ فیل میں قرآن کی واقعاتی تصویر دراصل قاری قرآن کو سمجھاتی یہ ہے کہ ضد اور تصلب کی انتہا کے اس واقعہ کو عملاً اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے بوڑھے ابھی پردہ وجود پر قائم تھے لیکن وہ تکبر، عناد اور حسد سے روحانی قوتوں سے انکار کئے جا رہے تھے جبکہ سورہ فیل انہیں سمجھا رہی تھی کل بھی رب محمد کی قدرت تم نے دیکھی کہ ابرہہ ایسے ظالم اور ڈھیٹ بادشاہ کے لشکر کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا آج بھی اگر کوئی رب محمد کی قدرت نہیں مانے گا تو وہ اس قادر و قدیر کی گرفت سے کیسے بچ سکے گا؟

انسانی تباہی کے عمومی محرکات عام طور پر زر پرستی، نفس رانی، ہوس اقتدار، شیطان خواہی اور عقل کا بے محابا اور بے تکا استعمال ایسی چیزیں بنتی ہیں۔ سورہ فیل کسی نہ کسی جہت سے تمام مخربات کی بنیادوں پر چوٹ مارتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے پنجوں میں پکڑے ہوئے مسور کی دال یا چنے کے دانے اتنے سنگ ریزوں سے تجربہ کار فوج کی تباہی منطق کی بنیاد پر کام کرنے والی عقول کو شکست دے دیتی ہے اور سورت اعلان کرتی ہے کہ عقل کا دائرہ محدود ہے اسے حاکم مطلق نہیں مانا جا سکتا ہے اور نہ ہی مجرد اس کی مدد کے ساتھ سارے مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ عقل سے ماوریٰ قوتوں کا ادراک بھی آزاد انسانوں کی منزل ہے۔ بلند پروازی کے لئے روح کی دنیا کا کوئی امام درکار ہوتا ہے۔ سورہ فیل اس عنوان کو ادھورا نہیں چھوڑتی، بتاتی ہے کہ عظمتوں کی راہوں کا مرشد عظیم وہی ہے جو محمد ﷺ ہے اور سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص حکمت ہدایت کے تحت ہی اپنی "ربوبیت" کو محمد ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے۔

وہ لوگ جو اپنی دولت، قبائلی جتھہ بندی، نسلی تفاخر، نفسی غرور، تجارتی استحکام اور سماجی فضیلت کی بنا پر تحریک اسلام کا راستہ روک رہے تھے اور محمد ﷺ کو شہر بدر کرنے پر تلے ہوئے تھے بلکہ اب تو ان کی حالت یہ تھی کہ حضور ﷺ کو شہید کرنے کی بھی سازشیں کرنے لگے تھے، انہیں یاد کروایا جا رہا ہے تم لوگ تو وہ ہو جو ابرہہ کے لشکر سے ڈر کر کعبہ تک کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ اپنے مال مویشی ہانک کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا بیٹھے تھے۔ اس وقت جس ذات نے اپنے گھر کی صیانت اور حفاظت فرمائی تھی، آج بھی وہ زندہ اور قیوم ذات دیکھ رہی ہے جس نے اسلام کے مرکز کو بچایا تھا وہ اسلام کے داعی کی بھی حفاظت فرمائے گا۔

سورہ فیل پڑھتے ہوئے عام طور پر لوگ ہاتھی والوں کی شان و شوکت، افتخار و غرور، عسکری قوت اور عددی کثرت ایسے عنوانات کے مطالعہ میں کھو جاتے ہیں لیکن جمالیاتی اعتبار سے فہم کا سارا جلوہ تو "الم تر" میں ہے یا پھر روحانی نظر ہو تو "کیف فعل" کے الفاظ اس راز سے پردہ ہٹاتے ہیں اور یہ بھی کہ "فعل ربک" میں جو گہرائی ہے، تعمق ہے اور بے پایاں وسعت ہے اسے الفاظ میں تھوڑا ہی سمویا جا سکتا ہے۔

دور حاضر میں صیہونیت اور صلیبیت جس طرح اسلام کے روحانی مراکز کی بربادی کے لئے سازشوں، خفیہ تدبیروں، مکر و فریب میں دن رات ایک کئے ہوئے ہے کس غیرت مند مسلمان کی نگاہ سے پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ سورہ فیل صلیبی اور صیہونی سازشوں کے انداز کو بے نقاب کرتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ دین اسلام کی حقیقی بنیادوں کو کوئی کھوکھلا نہیں کر سکتا ہے۔ ہر ابرہہ ذلیل ہے، صلیبیوں کی ہر سازش نابود ہے اور یہودیوں کا ہر اقدام ان کے اپنے ہی قدموں کو توڑ دینے والا ہے، جس اللہ نے اپنے کعبے کو ان شیطانوں سے بچایا وہ شعائر اسلام، دعوات اسلام اور تحریکات اسلام کی بھی خود حفاظت فرمائے گا۔

سورہ فیل کا شاندار موضوع وہ تسلی ہے جو دینی کام کرنے والوں کے لئے اللہ نے اس سورت میں رکھی ہے۔ رب کریم نے فرمایا ابرہہ کا لشکر جس طرح "عصف ماکول" کر دیا گیا تھا یعنی پتے جو مویشیوں کے نیچے ریزہ ریزہ ہو جائیں انہیں ایسے تباہ کر دیا گیا تھا۔ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے بھی ایک دن "عصف ماکول" بنا دیئے جائیں گے۔

سورت میں کعبہ تو دراصل اس عزت کا نشان ہے جو اللہ تعالیٰ خادمین رسول عربی کو عطا فرماتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝

''کیا آپ نے مشاہدہ نہیں فرمایا کہ کیسا کیا آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ''

سورہ فیل کی پہلی آیت ایک تاریخی واقعہ کو مرکز فکر بنا کر آگے بڑھتی ہے۔ حجاز مقدس کے بالکل پڑوس میں سرزمین یمن فارس حکومت کے اختتام کے بعد شاہ حبشہ کے زیر نگین آ گیا اس نے ابرہہ نامی ایک شخص کو یمن کا حاکم مقرر کر دیا۔ ابرہہ ایک چالاک حاکم کی حیثیت سے اپنے تعصبات کی تحریک کو عام کرنے کا خواہاں ہوا۔ اس نے سوچا مذہبی وابستگی رکھنے والوں کے لئے اس کے آقائے نعمت شاہ حبش کا مذہب پروان چڑھانا نہایت ضروری ہے اور یہ جبھی ممکن تھا کہ وہ عربوں کی توجہ کو مکہ معظمہ میں واقع بیت اللہ سے پھیر دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے یمن میں ایک گرجا تعمیر کروایا اور اس کے رعب داب کے لئے ممکنہ توانیاں خرچ کر دیں۔ ابرہہ نے اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک بڑی عسکری قوت کے ساتھ ''ذونواس'' اور ''ارباط'' یکے بعد دیگرے دونوں کو شکست دی تھی۔ ظاہر ہے اس کا عسکری گھمنڈ مذہبی قدروں کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہر آمر کی نفسیات یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز کا مرکز اپنی ہی ذات کو تصور کرتا ہے۔ ابرہہ اس خود پرستی کا شکار ہو چکا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ شاہ حبش نجاشی نے اس کی سرکوبی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس مکار آمر نے سر کے بال منڈوا کر یمن کی کچھ مٹی کے ساتھ نجاشی کی طرف بھیج کر اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا۔ اس پر نجاشی نے اسے معاف کر دیا اور یمن پر اس کی امارت قائم رکھی۔

ابرہہ نے اس کے بعد پرامن ماحول میں مذہبی دام تزویر میں لوگوں کو پھنسانے کی خاطر اپنے تعمیر کردہ گرجا کی آبادی کے لئے ہر طرف دعوت دینے والے بھیجے۔ عرب ''بیت اللہ'' سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی عقیدتیں اس ابراہیمی مرکز کے ساتھ انتہائی گہری تھیں وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص اپنی طاقت کے گھمنڈ پر اللہ کے گھر کی توہین کرے۔ دوسری طرف ابرہہ کی ذلتیں بام عروج تک پہنچ چکی تھیں، اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو گرجا تعمیر کیا ہے وہ بے مثال اور بے نظیر ہے۔ ذہنوں کی کشاکش عملی نفرتوں کی صورت اختیار کر گئی اور اس زمانہ میں کسی عرب نے ابرہہ کے تعمیر کردہ گرجا کو آگ لگا دی اور ایک دوسری روایت کے مطابق کسی شخص نے وہاں اس کے گرجا میں جا کر قضائے حاجت کر دی اور مخفی طور پر اسے گندہ اور آلودہ کر دیا۔ ممکن ہے ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے خود یہ ڈھونگ رچایا ہو جیسے آج کل امریکہ اور اس کے حواری مسلمانوں کے خلاف ایسے ہی کرتوتوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

یہ تھے وہ حالات کہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے لشکر کشی کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ کی طرف بڑھا اس کے لشکر میں ضاربین ہاتھیوں پر سوار تھے اور مفسدین کے آگے آگے ایک بڑا ہاتھی تھا غالباً اس کا نام محمود تھا۔ راستے میں کچھ عربوں نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے تمام مزاحمتوں کی سرکوبی کر دی۔ پہلے ''ذونفر'' کو شکست دی بعد ازاں قبیلہ خثعم کے سردار نفیل بن حبیب خثعمی کو بھی صرف شکست دے دی بلکہ منوالیا کہ وہ مکہ تک اس کی راہنمائی کرے گا۔

جب ابرہہ اپنے لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ سے قریب پہنچا تو اس نے پہلے مکہ والوں کے اموال اور مویشی لوٹنا چاہے۔ غارت گری کے دوران اس نے حضور ﷺ کی جد عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی لوٹ لئے اور کہا کہ رئیس مکہ عبدالمطلب کو تلاش کر کے مذاکرات کے لئے میرے سامنے پیش کیا جائے۔

صدق اور کذب روبرو ہو گئے

عبدالمطلب انتہائی حسین شخص تھے۔ بلند قامتی اور شخصی دبدبہ میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ خالص عربیت ان کے چہرے پر عیاں رہتی پھر حضور ﷺ کے میلاد کی رحمتوں نے ''عبدالمطلب'' کے چہرے پر حضور ﷺ کا دادا ہونے کا غازہ بھی مل دیا تھا۔ کعبہ کی خلیلی نسبت اگرچہ ابرہہ کا محاصرہ کر رہی تھی لیکن افق سے وہ اصل قوت اور روحانیت جس نے ابرہہ کو ڈھیر کرنا تھا وہ حضور ﷺ کا میلاد مبارک تھا لو صدق اور کذب دونوں روبرو ہو گئے۔

ابرہہ نے عبدالمطلب کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور پھر مترجم سے کہا ان سے پوچھو یہ کیا چاہتے ہیں؟ حضرت عبدالمطلب نے برجستہ تحکمانہ لہجے میں کہا ''میرے اونٹ واپس کر دو''۔

ابرہہ نے تعجب سے کہا میں تمہیں بڑا معاملہ فہم اور دانا رئیس سمجھتا تھا لیکن تم نے اونٹ طلب کر کے میری نظر میں اپنی عزت گھٹا دی۔ تم نے کعبہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

حضرت عبدالمطلب نے خاندانی وقار قائم رکھتے ہوئے جواب دیا:

انا رب الابل

و ان للبیت رباً سیمنعه

میں اونٹوں کا مالک ہوں

اور اس عظیم گھر کا بھی ایک رب ہے

وہ خود ہی اس کی حفاظت فرمائے گا

عبدالمطلب نے درکعبہ کی زنجیر تھام لی

عبدالمطلب نے اونٹ واپس لے لئے اور اہل مکہ سے کہا کہ وہ پہاڑی اور کوہستانی غاروں میں پناہ گزیں ہو جائیں اور خود ایک جماعت کے ساتھ حرم میں داخل ہوئے اور دروازہ کی زنجیر تھام لی، سلگتے جذبوں، بہتے آنسوؤں اور محکم یقین کے ساتھ دعا مانگی اور اللہ سے مدد کا استغاثہ کیا اور یہ اشعار پڑھے:

لا هم ان المرء یمنع

رحله فامنع رحالک

اے اللہ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما

لا یغلبن صلیبهم

و محالهم ابداً محالک

اے اللہ ان کی صلیب کعبے پر غالب ہرگز نہ آئے اور ان کی قوت تیری قوت پر غالب نہ ہو۔۔۔"

ان کنت تارکهم وقبلتنا

فامر ما بدالک

اور اگر تو نے انہیں اور ہمارے قبلے کو چھوڑ ہی دیا تو ہم تیرے حکم کے سامنے کیا کر سکتے ہیں

یا رب لا ارجو لهم سواک

یا رب فامنع منهم حماک

اے رب مجھے تیرے سوا کسی سے امید نہیں اے رب اپنے حرم کو ان سے بچا لے

ان عدو البیت من عاداک

امنهم ان یخربوا قراک

بے شک اس گھر کے دشمن نے تجھ سے دشمنی کی ہے اے رب اس محفوظ مقام کو تباہی سے بچا۔۔۔۔۔"

شہر کا منظر بدل گیا

یہ ہے وہ جگہ جہاں سے منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ ایک سیاہ لشکر ہاتھیوں کو مقدمہ اور میمنہ بنائے، ابرہہ شہر نور کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے وہم میں بھی نہ تھا کہ اب کعبہ "کاشانہ آمنہ" کو سلامی دینے ہی والا ہے۔ فضائیں اور ہوائیں بدل چکی ہیں۔ ابرہہ نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کا ہاتھی شہر سے پہلے ہی بیٹھ گیا۔ بالکل اسی جگہ جہاں حدیبیہ کے دن حضور ﷺ کی سواری رک گئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا "قصوا اڑی نہیں بلکہ اسے اس اللہ نے روک دیا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھی کو روک دیا تھا"۔ لیکن دونوں منظروں میں فرق تھا کہ ابرہہ کا ہاتھی تباہی کا پیغام لے کر رکا تھا اور حضور ﷺ کی اونٹنی عزت و فضیلت کا نشان بن کر ٹھہری تھی۔

مکہ معظمہ کی فضا تھوڑی دیر کے لئے جیسے ابر آلود ہو گئی ہو۔ ساحل سمندر کی جانب چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول گروہ در گروہ نمودار ہونے لگے۔ ہر پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ چنے یا مسور کے دانے برابر، ایک چونچ میں دبائے اور دو دونوں پنجوں میں رکھے ہوئے دفعۃً ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ کنکر سر پر بجتی اور پاؤں کے تلووں سے آگ کا شعلہ بن کر نکل جاتی۔ ابرہہ کا لشکر وحشت کا شکار ہوا، زیادہ تر لوگ ہلاک ہو گئے، جو بچ کے نکلے ابابیل نے ان کا پیچھا کیا اور انہیں سڑا ہوا بھوسا بنا دیا۔ ابرہہ خود زخمی ہوا اور صنعا پہنچ کر ذلت کی موت مر گیا۔

قرآن مجید کی دعوت میں غور و فکر

آیت کو سمجھنے کے لئے ترتیب نکات یہ ہوگی:

الم تر

کیف فعل

ربک

باصحاب الفیل

کیا آپ نے دیکھا نہیں

کیا کیفیت تھی؟

کیسے اور کیا کیا

تیرے رب نے

ہاتھی والوں کے ساتھ

قارئین!

یہ حادثہ اور تاریخی واقعہ اس وقت رونما ہوا جب حضور ﷺ کے دنیا میں آنکھ کھولے ہوئے چند دن گزرے تھے۔ قرآن کا حضور ﷺ کو یہ کہنا:

کیا آپ نے دیکھا نہیں؟

لگتا ہے رسول کی نظر میں ہماری طرح تحدید نہیں ہوتی۔ اللہ کی عطا سے آپ جب چاہیں دیکھ لیتے ہیں۔ کلام باری میں کذب یا مبالغہ تو نہیں بات تو صرف ماننے کی ہے، جب رسول مان لیا تو پھر بعد یا عجب کیا ٹھہرا یہ بھی تو ہو سکتا ہے منظر کو اٹھا کر رسول معظم کے سامنے رکھ دیا گیا ہو اور پھر کہا گیا ہو الم تر۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کے مبارک میلاد سے اتنا قریب تھا کہ حادثہ کے آثار عصری اعتبار سے متواء اور ثابت تھے اور حضور ﷺ گویا یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ (تفسیر کبیر: رازی)

کیف فعل

تیرے رب نے کیا کیا؟

قارئین فہم آیت کی ساری لذتیں اور لطافتیں اس میں ہیں کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو اپنے ماحول سے جدا کر کے شہر دلبر مکہ معظمہ لے جائیں اور چودہ صدیوں کے بے کراں لمحاتی سمندر کا گھونٹ بھر لیں اور نسبت رسول ﷺ کا سرمہ نگاہوں میں ڈال کر عام الفیل کا مشاہدہ کریں، آپ کو محسوس ہو جائے گا جس شہر میں حضور ﷺ کا میلاد ہونا تھا اور جس گھر کو رسول معظم نے مرکز عبادت بنانا تھا اس کی حفاظت کس قدر اہتمام سے ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں نے بڑے بڑے سورماؤں کا کبر و غرور خاک میں ڈھیر کر دیا۔ اب کنکریوں کو دیکھنے سے کچھ نہیں ملے گا مزا سارا تو ظہور نبوت کے منظر روحانی کو آنکھوں میں لانے سے ملے گا۔

ربک

تیرا رب

آپ کا رب

تیرا پالنے والا

آپ کا پروردہ

قرآن پڑھنے والوں اور کتاب مجید کو مشعل راہ بنانے والوں کے لئے ایک اہم سبق کہ خدا شناسی دولت ہے۔ انسانی ضرورت ہے، ذریعہ نجات ہے اور منہاج عزت و فضیلت ہے لیکن اس کے لئے

"ربک"

کا اعتقادی اور عملی نظام سمجھنا ہوگا اور بذریعہ رسول منزل کی طرف بڑھنا ہوگا۔ عدل و انصاف سے ضمیر اور نفس دونوں کو ٹھوکر مار کر فیصلہ فرمائیے۔

"ربک" کہنے میں یہ جمالیاتی غذا انسان کے دل و دماغ دونوں کی ضرورت کو پورا نہیں کر دیتی۔

ہاتھی والوں کے ساتھ جو ہوا وہ تو ہوا ہی ہوا

لیکن سمجھنے والی بات یہ ہے کہ کیا کس نے اور وہ رب کس کا ہے۔ پس اسے تلاش کرو علم کی اصل وہی ہے لیکن وہ خود کہتا ہے میں ان کے بغیر ملتا نہیں من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

آیت کی تفسیر میں رازی نے اس سوال کا جواب بھی دیا ہے کہ فعل، جعل، خلق اور عمل میں سے اللہ رب العالمین نے "فعل" کا انتخاب کس حکمت کی بنا پر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں خلق کا مادہ ابتدائے فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جعل بیان کیفیات کے لئے ہوتا ہے اور عمل طلب کے بعد ہوتا ہے جبکہ فعل عام ہے۔ بلاغت کلام اسی میں ہے وگرنہ کلام طویل ہو جاتا۔ (تفسیر کبیر: رازی)

ابرہہ کے لشکر کو قرآن حکیم نے "اصحاب الفیل" کہا۔ رازی لکھتے ہیں کہ ارباب الفیل کے برعکس "اصحاب الفیل" کی اصطلاح اس حقیقت سے پردہ ہٹاتی ہے کہ وہ لوگ گویا ہاتھیوں کی جنس سے تھے۔ عقل کا معدوم ہونا، بات کو نہ سمجھنا اور بہیمیت کا عروج پر ہونا بلکہ دو شخصوں میں اگر مصاحبت ہو تو ایک بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا جیسے ایک پیر ہو اور دوسرا مرید ہو تو صاحب وہ ہوگا جو چھوٹا ہو بڑا صاحب نہیں کہلائے گا جیسے حضور ﷺ کے صحابہ تھے یہاں اصحاب الفیل کہنے میں اشارہ اس طرف ہوا کہ یہ لوگ ہاتھیوں سے بھی گئے گزرے تھے اس لئے کہ ان کے ہاتھی تو کعبے کی طرف بڑھتے ہی نہ تھے، ابرہہ نے تنگ آ کر انہیں شراب پلائی شاید وہ مست ہو کر آگے بڑھ جائیں لیکن ناکام ٹھہرا۔ "اصحاب الفیل" کہنے میں ان کی تمام رذالتوں کی طرف بلیغ اشارات نے ایک سرور کی سی کیفیت پیدا کر دی۔

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝

کیا اُس نے اُن کے مکر و فریب کو بے اثر نہیں کر دیا

سورت کی دوسری آیت ایک دوسری نعمت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اللہ نے اپنے گھر کی صیانت اور حفاظت، اپنے نبی کی ولادت کے موقع پر جہت رحمت کے تعین اور اپنی قدرت کے اظہار کے لئے ہاتھی والوں کے مکروہ منصوبہ کو انہی کی طرف پھینک دیا۔ اصل میں تو قریش کو شرم دلانا مقصود تھا کہ ان کی نصرت و حمایت کے بغیر اللہ تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں سے ایک بڑے لشکر کو تباہ کر دیا۔ خانہ کعبہ کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس کا دبدبہ، عزت اور فضیلت مزید بڑھ گئی اور مشتاق دل پہلے سے بھی زیادہ اس سے محبت کرنے لگ گئے۔

ایک بات قابل توجہ ہے کہ ابرہہ نے جس وقت اپنے مکر و حرب سے خانہ کعبہ کی رونقیں پائمال کرنے کی کوشش کی اس وقت کعبہ میں سینکڑوں بت پڑے تھے۔ کعبہ کے زیادہ تر پاسباں مشرک تھے اور حملہ آور گروہ عیسائیوں کا تھا اگرچہ صلیب کے تصور اور عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ یا ابن اللہ ماننے کے عقیدہ نے سب کو یکساں کر دیا تھا، تاہم پھر بھی ایک طرف کتاب ماننے والے تھے اور دوسری طرف نہ ماننے والے تھے، پھر وجہ کیا تھی کہ کعبہ کی حفاظت ایسے اہم کام کے لئے بظاہر کتاب ماننے والوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا گیا۔ سید قطب کے الفاظ مجھے پسند آئے۔ آپ لکھتے ہیں بات صرف یہ تھی کہ جدید اسلامی عقیدے کے برپا ہونے تک اس سرزمین کی آزادی کو قائم رکھنا مقصود تھا تاکہ اس پر کسی بادشاہ کا تسلط نہ ہو، اللہ نے یہ تدبیر آنے والے نبی اور اس کے دین کے لئے کی تھی قبل اس کے کہ کسی کو پتہ چلے کہ اس دین کا نبی اس سال ولادت پا چکا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

اگر ذہن میں یہ بات ابھرے کہ "کید" تو خفیہ تدبیر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ ابرہہ نے تو لشکر کشی دن کی روشنی میں کی اور اس کے کبر و غرور اور ضد اور ڈھٹائی کا تو اتنا چرچا ہوا کہ عربستان میں کوئی آدمی ایسا نہ بچا جس کو اس کی نخوت زدہ جنگی کوشش کا پتہ نہ چل گیا ہو۔ رازی نے اس کا جواب یہ لکھا کہ وہ شر جو ابرہہ کے دل میں تھا وہ اس کی جنگ سے کہیں زیادہ تھا وہ تو عربوں کے شرف و فضیلت کا تاج نوچنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ قرآن نے اس کی اس بدباطنی کی طرف "کید" کہہ کر اشارہ کیا۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝

اور اُن پر ہر سمت سے پرندوں کے ڈاروں کے ڈار بھیج دیئے

عبدالمطلب ابھی دہلیز کعبہ پر اپنے رب سے استغاثہ کر ہی رہے تھے کہ عجیب خلقت رکھنے والے چھوٹے چھوٹے پرندے اپنے پنجوں میں سنگریزے دبائے ارض مقدس کی فضاؤں میں چھا گئے۔ قرآن حکیم نے ان پرندوں کا نام "ابابیل" بتایا ہے یہ سیاہ رنگ پرندے تھے۔ ان کی چونچیں سرخ اور گردنیں سبز تھیں۔ حضرت ابو سعید خدری ؓ کے نزدیک وہ پرندے سیاہ رنگ کبوتر تھے۔ بعض نے کہا کہ یہ وہ چڑیاں ہیں جنہیں "زرازیر" کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ابابیل کی ناک پرندوں ایسی تھی اور ہتھیلیاں اور داڑھیں کتوں جیسی تھیں۔ (تفسیر کبیر) کسی حد تک چمگادڑ سے ملتے جلتے پرندے تھے۔ حضرت عکرمہ نے مغرب کی طرف کے "عقبا" کو ابابیل روایت کیا ہے۔

پہلے انبیاء کی اقوام کو جن عذابوں میں گرفتار کیا گیا تھا وہ سب کے سب طبعی نوعیت کے تھے۔ طوفان نوح کی تباہ کاریاں، قوم لوط کا زلزلہ

اور سنگ باری، قوم عاد کی ہلاکت آفرین آندھی اور قوم ثمود کی کڑک، لیکن ابرہہ کو جس طرح ہلاک کیا گیا اس میں بھی کسی کی آمد کا اعجاز بول رہا تھا کہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کا لپکنا، ایک لشکر بن کر ابھرنا، کنکریاں برسانا، ایک منصوبہ بندی کے ساتھ فرد فرد کو تعین سے نشانہ بنانا اور پھر ان کو ریزہ ریزہ بنا چھوڑنا، سب بڑے نبی کی آمد کا معجزہ بن کر ظاہر ہو رہا تھا۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ

جو ان پر نوکیلی تیز دھار کنکریاں پھینکتے تھے

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ مقاتل کا یہ قول ہے کہ ہر پرندہ تین سنگریزے اٹھائے تھا، ایک چونچ میں اور دو دونوں پنجوں میں۔ ہر سنگریزے پر اس شخص کا نام لکھا تھا جس کی موت اس سے مقدر تھی۔ رازی لکھتے ہیں کہ سنگریزہ سر پر بجتا اور دبر سے نکل جاتا۔

عکرمہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں پتھر جونہی کسی کو زخمی کرتا جلد پھٹتی اور چیچک کا مرض نمودار ہو جاتا۔ (تفسیر کبیر، روح البیان، روح المعانی، تفسیر ابن جریر)

سجیل پر علامہ رازی نے لکھا کہ وہ دیوان جس میں عذاب کفار لکھا ہے اس کا نام سجیل ہے۔ جیسے کہ دیوان اعمال کا نام سجین ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ پتھر جیسے کہ سجیل میں لکھا تھا اس کے موافق ہی ہر پرندہ اپنے منہ میں دبا کر اپنے ہدف پر حملہ کرتا۔

رازی نے دوسری توجیہہ یہ کی کہ جیل اسجال سے ہے اور یہ ارسال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی عذاب بھیجنا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے وہ کنکریاں حضرت ام ہانی کے گھر ایک سرخ دھاری دھار بوری میں دیکھی تھیں جو ظفاری مہرے جیسی تھیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سجیل اصل میں فارسی کا لفظ ہے جو سنگ اور گل سے مرکب ہے۔ سنگ پتھر کو کہتے ہیں اور گل مٹی کو کہتے ہیں۔ رازی نے بھی لکھا کہ یہ سنگریزے بعض سخت پتھریلے تھے اور بعض مٹی سے بنے ہوئے تھے۔

ابو عبیدہ نے سجیل شدید کے معنوں میں لیا ہے اور یہ بھی مفسرین نے لکھا کہ آسمان دنیا کا نام بھی سجیل ہے اور رازی نے اپنی تفسیر میں پانچواں قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ جیل جہنم کے پتھروں میں سے ہے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

یوں انہیں اس نے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا کر رکھ دیا

اللہ جل مجدہ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے ڈار اور غول بھیج کر ان کے پنجوں میں پکڑے ہوئے کنکروں کے سبب سے ان لوگوں کو ایسا تباہ کیا کہ وہ چورا چورا ہو گئے۔ عصف گھاس یا درختوں کے پتے اور شاخیں یا جوار گندم وغیرہ کے پتلے جانور کھانے کے بعد بچے ہوئے آخور کو چورا چورا کر دیتے ہیں یا وہ بھس جو کھانے کے لئے تیار ہو "ماکول" لفظ اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے یا ممکن ہے کھایا ہوا چارا جو چورا چورا ہو کر لید کی صورت میں نکلتا ہے۔ اسے بھی "عصف ماکول" کہا جا سکتا ہے۔

سورت کے روحانی اسباق

سورت دعوت دیتی ہے کہ تاریخ عبرت گیری کے لئے پڑھنی چاہیئے _____"

سورت قاری قرآن کے اندر مشاہداتی قوت بیدار کرتی ہے اور دیکھنے والی آنکھ کی تعریف کرتی ہے _____"

یہ سورت اللہ جل جلالہ کی بے پایاں قوت پر یقین پیدا کرتی ہے _____"

سورت رب کریم کی شان "ربوبیت" کا یہ مظہر بھی سامنے لاتی ہے کہ تربیت کے لئے نوازش ہی کافی نہیں ہوتی فہمائش اور تہدید بھی ضروری ہوتی ہے _____"

سورت عقیدہ سازی کرتی ہے۔ کفر و باطل کی ہر سازش اور ہر مکر بالآخر اکارت چلی جاتی ہے _____"

یہ سورت یہ بھی سکھاتی ہے کہ اللہ کی پکڑ اور گرفت سے ڈرنا چاہیئے وہ چاہے تو چھوٹے چھوٹے پرندوں سے ہاتھی والوں کو تہس نہس کر دے _____"

سورت کے اندر قاری قرآن کے لئے یہ سبق بھی موجود ہے کہ روحانی مراکز کی حفاظت کی جانی چاہیئے _____"

سورت کی اٹھان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کفر اور باطل کا ہر پرستار بالآخر بھس اور لید کی طرح ذلیل ہو جاتا ہے _____"

سورہ فیل حضور ﷺ کی ولادت کا حوالہ بن کر اتری۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ میلاد نام ہے جو دفع بلیات و آفات کے لئے قاسم رحمت

ہے

اللہ رب العالمین کی بارگاہ بے کس پناہ میں دعا، التجا اور درخواست کہ وہ اپنے کرم کے ابابیلوں سے نفسانی خواہشات کے ہاتھیوں کو کٹی ٹوٹی بکھری گھاس کی مانند کر دے۔

یارالٰہا روحانیت کو جلا بخش

ذہنوں کو بصیرت سے نواز

اور

جو تیرا، تیرے رسول اور تیرے گھر کا دشمن ہے تو خود ہی اس کے لئے کافی ہو جا۔

مسلمانوں کو ہمت دے

جذبہ عطا فرما

ذوق جہاد بخش

تاکہ زندگیاں تیرے نام کا چڑھاوا بن جائیں

آمین یا رب العالمین وعلیک التکلان والاعتماد

لا تطردنا الی نفوسنا طرفة عین یا رب یارب

یارب والصلوٰة والسلام علی حبیبک و آل حبیبک و اصحاب حبیبک اجمعین

✿ ✿ ✿

نااہل لوگوں کی سربراہی ۔۔۔۔۔۔قیامت کی نشانی ہے

مفتی محمد صدیق ہزاروی

عن ابی هریرہ (رضی اللہ عنہ) قال بینما النبی ﷺ فی مجلس ، یحدث القوم جاءہ اعرابی فقال متی الساعۃ ؟ فمضی رسول اللہ ﷺ یحدث فقال بعض القوم سمع ما قال فکرہ ما قال وقال بعضهم بل لم یسمع حتی اذا قضی حدیثہ قال این اراہ السائل عن الساعۃ قال ھا انا یا رسول اللہ قال فاذا ضیعت الامانۃ فانتظر الساعۃ قال کیف اضاعتها قال اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعۃ (صحیح البخاری، کتاب العلم باب من سئل علماء وهو مشتغل فی حدیثہ خاتم الحدیث ثم اجاب السائل)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اس دوران کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں حاضرین سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی (دیہاتی) آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب ہوگی؟ رسول اکرم ﷺ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا، حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اکرم ﷺ نے اس شخص کی گفتگو کو سنا اور اسے ناپسند کیا اور بعض حضرات نے کہا کہ آپ ﷺ نے اس کی گفتگو کو نہیں سنا حتیٰ کہ جب آپ اپنی گفتگو سے فارغ ہو گئے تو فرمایا کہاں ہے، راوی فرماتے ہیں میرا خیال ہے آپ نے فرمایا قیامت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس نے عرض کی یارسول اللہ! میں باہر ہوں آپ نے فرمایا جب امانت ضائع ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرو، اس نے عرض کیا امانت کس طرح ضائع ہوگی؟ آپ نے فرمایا جو کوئی ذمہ داری کسی نااہل کے سپرد کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔"

اس حدیث پاک میں ہمارے لئے کئی اسباق موجود ہیں لیکن اس کا بنیادی موضوع جو سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہ نااہل لوگوں کو مناصب سپرد کرنے سے روکنا ہے کیونکہ یہ امانت کا ضیاع ہونے کا سبب ہے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب العلم میں نقل کرتے ہوئے اس کے لئے یہ عنوان قائم کیا کہ جب کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو تو اسے اپنی گفتگو مکمل کر کے سائل کا جواب دینا چاہئے۔ جبکہ رسول کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہو رہا ہے اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ پوچھنے والے کو انتظار کرنا چاہئے۔ جب وہ عالم اپنی گفتگو سے فارغ ہو تو پھر سوال کیا جائے، درمیان میں بولنا اور سوال کرنا آداب کے خلاف بھی ہے اور اس سے گفتگو کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے اور چاشنی باقی نہیں رہتی جو اس گفتگو یا خطاب میں پائی جاتی ہے اور توجہ بھی ہٹ جاتی ہے لہٰذا جب کوئی لیکچر ہو رہا ہو یا خطبہ اور تقریر ہو رہی ہو تو اس کے اختتام پر سوالات کئے جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ آپ کے خلق عظیم کی روشن دلیل ہے اور ہمارے لئے آپ کی حیات طیبہ بہترین نمونہ ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اگر کوئی آداب سے ناواقف شخص تقریر کے دوران سوال کرے تو اسے ڈانٹ دیا جائے اور ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کیا جائے بلکہ اسے جواب دینے یا جھڑکنے کی بجائے گفتگو جاری رکھی جائے سائل خود بخود خاموشی اختیار کرے گا۔ گویا سائل اور مسئول عنہ دونوں کے لئے اس حدیث میں راہنمائی موجود ہے۔ حدیث میں شریف میں لفظ اعرابی کی بجائے یہ بھی کہا جا سکتا تھا "جاء رجل" "ایک شخص آیا کیونکہ لفظ رجل شخص میں عموم ہے یہ لفظ دیہاتی اور شہری دونوں میں بولا جاتا ہے لیکن اس میں یہ سب بتانا مقصود ہے کہ دیہاتی اور شہری کے انداز میں فرق ہونا چاہئے، شہری جس طرح آداب محفل سے واقف ہوتے ہیں دیہاتی اس طرح آداب محفل کو نہیں جانتے کیونکہ شہر میں علم ہوتا ہے اور دیہات میں نہیں پایا جاتا بالخصوص اسلام کے ابتدائی دور میں جب وہ زمانہ دور جہالت سے متصل تھا۔ لہٰذا اس انداز کو اختیار کرنے میں شہری (یعنی پڑھا لکھا) اور دیہاتی (ان پڑھ) دونوں میں فرق ہونا چاہیے۔

صحابہ کرام نے رسول اکرم ﷺ کے جواب نہ دینے سے بطور قیاس دو باتیں ثابت کیں ایک گروہ نے سوچا کہ رسول اکرم ﷺ تو خلق عظیم کے مالک ہیں اور آپ کسی شخص کے سوال کا جواب دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے بلکہ احادیث مبارکہ میں تو یہاں تک آتا ہے کہ نماز کے لئے اقامت ہو جاتی اور کسی شخص کو آپ سے کوئی کام ہوتا تو آپ پہلے اس کی بات سنتے اور یہی نہیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ اگر کسی گلی میں بھی مجھے کھڑا کر کے اپنی حاجت پیش کرو گے تو میں اسے سنوں گا۔

اس بنیاد پر بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ رسول ﷺ نے اس شخص کی بات نہیں سنی (ورنہ آپ گفتگو توڑ کر اس کا جواب ارشاد فرماتے)۔

صحابہ کرام کے دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے اس کی بات سنی ہے لیکن اس کے سوال کو پسند نہیں فرمایا اس لئے جواب نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کرنا اچھی بات نہیں کیونکہ تمہیں قیامت کی تیاری کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ قیامت جب بھی قائم ہو اگر ہم نے اس کے لئے تیاری کر رکھی ہوگی تو ہمیں کوئی ڈر نہیں ہوگا چنانچہ ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے اس قسم کے سوال کہ سائل سے پوچھا کہ تم نے اس کے لئے تیاری کیا کی ہے؟ تو اس نے جواب دیا (فرائض کے علاوہ) کوئی

خاص تیاری نہیں کی البتہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو قیامت کے وقت کا علم نہیں بلکہ آپ نے امت کی تربیت فرمائی کہ تم بنیادی بات کی طرف متوجہ رہو اور وہ قیامت کے لئے تیاری کرنا ہے۔ البتہ آپ نے قیامت کی نشانیاں بتا کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی عطا سے قیامت کے وقت کا بھی علم رکھتا ہوں لیکن اس کے اظہار کی اجازت نہیں ہے۔

رسول اکرم ﷺ جب اپنی گفتگو مکمل کر چکے تو سائل کو دوبارہ سوال کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ خود اس کے بارے میں پوچھا اور اس کے سوال کا جواب دیا اس سے نہ صرف آپ کے اخلاق عالیہ کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ آپ اپنے فرض منصبی کو پورا کرنے میں کس قدر مستعد تھے۔

ہمارے ان علماء کرام اور مفتیان عظام کے لئے رسول اکرم ﷺ کا یہ عمل لمحہ فکریہ ہے جو طرح طرح کے حیلے بہانوں سے عوام الناس کی علمی پیاس بجھانے میں کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں (معذرت کے ساتھ) راقم یہ بات اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر عرض کر رہا ہے کہ ہمارا اس تن آسانی، سہل پسندی، فرض منصبی سے روگردانی کا نتیجہ نہایت بھیانک شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اور بے شمار لوگ بدعقیدہ لوگوں کے چنگل میں پھنس رہے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے قیامت کی نشانیاں ان الفاظ میں بیان فرمائیں کہ جب امانت ضائع ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرو (یعنی قیامت صغریٰ) اور آپ نے امانت کے عموم کو بھی واضح فرمایا اور بتایا کہ امانت صرف مال میں نہیں ہوتی بلکہ کوئی دینی یا دنیوی منصب کسی نااہل کے سپرد ہو جائے تو یہ امانت کو ضائع کرنا ہے۔

ہائے افسوس! اس وقت یہی صورت حال ہے اور رسول اکرم ﷺ کی صداقت ظاہر ہو رہی ہے۔

اہتمام کے لائق نہیں لیکن مہتمم ہے، تدریس کی صلاحیت نہیں لیکن مسند تدریس کی زینت بنا ہوا ہے، خطابت کے اسرار و رموز اور حکمت و دانائی سے عاری ہے لیکن خطیب اعظم سے نیچے رکنے کا نام نہیں لیتا، انگریزی میں مافی الضمیر کے اظہار سے نابلد ہے لیکن خطیب یورپ ہے، عربی میں گفتگو کا سلیقہ نہیں لیکن خطیب عرب و عجم کا سہرا سجانا ضروری ہے، تصنیف و تالیف کے کہتے ہیں اس کی ابجد سے واقف نہیں لیکن مصنف بننے کا شوق زوروں پر ہے۔

حلال و حرام کی تمیز سے عاری ہے، حرص و لالچ کا پجاری ہے، اس کے باوجود صدارت، وزارت اور دیگر مناصب کے شوق نے پاگل کر رکھا ہے۔ باصلاحیت لوگوں کی حوصلہ شکنی اور نااہل چاپلوس لوگوں کی حوصلہ افزائی ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ جس کی وجہ سے ادارے تباہ ہو رہے ہیں، دین نااہل لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بن چکا ہے اور من مانی تاویلوں کے ذریعے اہل ثروت اور اہل اقتدار کی غیر شرعی حرکات کو شریعت کا لبادہ پہنانے والے خود ساختہ سکالرز اور جہالت کی بنیادوں پر علمی وجاہت تعمیر کرنے والے نااہل لوگوں نے اہل حق کے لئے آزمائش کا سماں پیدا کر دیا، نہ بولنے کا یارا نہ چپ رہنا گوارہ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ رب کریم ہماری سیاست اور ہمارے دین کو نااہل لوگوں کے چنگل سے آزاد کر دے۔ آمین۔

☆☆☆

حضرت امام زین العابدین علی بن امام حسین رضی اللہ عنہ

تصنیف: عبدالعزیز سید الاہل

ترجمہ: عبدالصمد صارم الازہری

عرب فوجیں فارس کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی تھیں اور خود فارس کے عوام بھی ان قلعوں کی شکست و ریخت میں عرب بہادروں کے مددگار بن گئے تھے، وجہ یہ تھی کہ شاہِ کسریٰ، ملک رانی اور قوم و رعایا کے حالات کو سنبھالنے میں بالکل نکما ثابت ہو چکا تھا۔ عوام زرتشتی عقیدے کے حامل تھے اور خیر و شر کے دو خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تمام رعایا اپنی زبوں حالی کو دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ خیر کے خدا نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے وہ ہر طرح سے ہم پر غالب و منصور ہو چکا ہے اور ہم سب کو اس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے۔

شاہی قلعہ میں ہر فرد پر خرمستیاں سوار تھیں، شاہی انتظامات میں سب سے زیادہ جس مسئلہ کو اہمیت تھی وہ شاہی دسترخوان کا نظم تھا۔ اس کے لئے خود بادشاہ نے ضوابط مقرر کر کے رنگ رنگ کے لذیذ کھانے اور سونے چاندی کے جام و مینا میں بادۂ پرکیف کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ درباری امراء میں اسراف عام تھا۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ شاہی عیاشی کی تقلید کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مقابلہ کر رہے تھے، عام پبلک کو قہرمانی طاقت کے زور سے شب و روز محنت و مشقت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، تاکہ ان کی گاڑھی کمائی سے زر و سیم کے پیالوں کے تقاضے پورے ہوتے رہیں، شراب و ساغر کے دور چلیں اور بڑوں کے پیٹ بھریں لیکن فاتحین عرب جو برابر فتح اور کامیابی سے ہم کنار آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں، ان کا یہ حال تھا کہ بھوک کی حالت میں وہ اپنے شکموں پر پتھر باندھتی تھیں، صبر و تقویٰ ان کا شعار تھا ان کا امام عرب کا بہترین خلیفہ عمر بن الخطاب تھا جو تمام روئے زمین پر بسنے والوں کے لئے عدل و مساوات کو پسند کرتا تھا اور اسی مقصد کے لئے وہ تمام انسانوں کو قابو میں لینا چاہتا تھا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ اگر میری زندگی نے وفا کی تو روئے زمین کے آخری کنارے پر بسنے والے انسان کو بھی اس کا پورا پورا حق پہنچا دوں گا اور کسی کو مظلومیت سے کراہنے نہ دوں گا۔

غرض عربوں نے قلعوں کے دروازوں کو کھٹکھٹایا اور کامیاب ہوئے۔ انہوں نے قلعوں کی دیواروں کو ہلا ڈالا۔ عام رعایا یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور لوگ ایک اچھی حکومت کے امیدوار تھے۔ وہ اس خدائے شر کے بدترین دشمن ہو گئے تھے، جس نے ان کے جسموں کو اس لئے غلام بنا رکھا تھا تاکہ امراء داد عیش دیں۔ وہ اسی لئے ان کے شکموں کو بھوکا رکھتا تھا تاکہ درباریوں اور شہنشاہ کے عیش کو چار چاند لگ جائیں۔ انہیں جب عرب فوجوں کے جلو میں ایک خدائے خیر کی خوشخبری ملی، وہ خدائے واحد جس نے تمام انسانوں کو برابری اور مساوات بخشی تھی تو انہوں نے اپنی کدالوں کے رخ اس بڑھتے ہوئے اسلامی لشکر کو مدد دینے کی طرف پھیر دیئے یا پھر کچھ قاصر الہمت اور شکستہ عزم لوگ تھے جنہوں نے اگر قلعوں کی دیواریں توڑنے میں ان کی مدد نہیں کی تو ان کا مقابلہ بھی نہیں کیا۔ بہرحال فاتحین کے لئے عقیدوں کا سر کر لینا ایک معمولی نوعیت کا واقعہ ثابت ہوا، امراء اور شاہی خاندان نے فرار اختیار کیا، حیران پریشان اور سرگرداں، مشرق یعنی بلادِ ہند سندھ کا رخ کیا۔ بقیہ رعایا کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلا رہے تھے گویا ان کی مشقت و مصیبت کا دور ختم ہو رہا تھا، وہ فاتحین کو خوش آمدید کہہ رہے تھے کیونکہ اب امن کا دور دورہ تھا، ان کی عقیدت کی پیشانیاں اس خدائے خیر کی بارگاہ میں جھک رہی تھیں جو ان کے لئے پیغام مسرت و بشارت بن کر نمودار ہوا تھا۔ خدائے شر یعنی "اہرمانِ قدیم" آج ان کے پاس سے جا چکا تھا وہ قصر ی اور اس کے امرائے دربار کے ساتھ مشرقی سرحدوں کو عبور کر کے بھاگ چکا تھا اور وہ بہت دور بھاگ گیا تھا۔

"یزدجرد" مدائن سے بھاگ کر فارس کی مغربی جانب شہر "کابل" میں پہنچا۔ کابل میں شاداب چراگاہیں اور عود و زعفران کی کثرت ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوستان و سجستان کے اس درمیانی سرحدی علاقہ کو اس نے دادِ عیش دینے کے لئے منتخب کیا۔ وہ اپنے ہمراہ اپنی کنیزوں، گھر والوں اور شہزادیوں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ کو درست کیا اس کی حفاظت کے لئے پہرہ دار فوجیں متعین کیں۔ وہ فوجیں جن کا مقصد حیات اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شاہ کی لذت کوش زندگی کی حفاظت کریں اور ہر قسم کے خوف و ہراس کو اس سے دھکیل دیں، لیکن کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ عربی فوجیں کابل میں بھی داخل ہو گئیں۔ انہوں نے وہاں بھی کسریٰ کے دروازوں کو جا کھٹکھٹایا۔ شاہی فوج نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب کہ قلعہ کے محافظ مر گئے۔ اعیانِ سلطنت اور یزدجرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ فاتحین کو حق پہنچتا تھا کہ وہ مردوں اور عورتوں کو قید کریں کیونکہ نہ انہوں نے ہتھیار ڈالے تھے اور نہ قتال و قہر سے باز آئے تھے شہزادیاں قید ہو کر امیرِ لشکر کی خدمت میں پیش ہوئیں جن کو فوراً دوسرے قیدیوں کے ہمراہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا گیا کہ وہ ان سے متعلق جو چاہے فیصلہ کریں، تمام امور کا انہی کو اختیار ہے خواہ آزادی بخشتے ہوئے واپسی کی اجازت دیں یا قیدی بنا کر وہیں رکھیں۔ یہ قیدی دارالخلافہ مدینہ میں پہنچے۔ مدینہ میں اس سے پیشتر اتنی کثیر تعداد میں اور اس قدر بھاری قیمت رکھنے والے عظیم الشان قیدی کبھی نہ پہنچے تھے عرب کے مقبول اور اونچے گھرانوں کے لوگ ان قیدیوں کو خریدنے کے خیال سے دارالخلافہ کی طرف رخ کرنے لگے۔ ان قیدیوں کے عوض

جو کچھ قیمتیں وصول ہوئیں وہ بیت المال میں داخل کر دی گئیں۔ الغرض خلیفہ کی رائے یہی ہوئی کہ ان لوگوں کو فروخت کر دیا جائے چنانچہ لوگوں نے بھی خریدنے میں دلچسپی لی۔

قیدیوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی قسمت کے اس فیصلہ پر خود کو بالکل تیار پا رہے تھے کیونکہ ان کو نظر آ رہا تھا کہ ہمیں اب ماضی کے ظلم واستبداد، قتل، بھوک اور ذلت سے نجات مل جائے گی پھر ان کی فروخت کا یہ واقعہ ان کے لئے انوکھا بھی نہ تھا کیونکہ وقت کا عام قانون یہی تھا، نیز ان ہونے والے غلاموں اور باندیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں پر قانونًا ان کے حقوق بالکل وہی ہیں جو عام احرار کے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو خریدنے والے پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ مملوکوں کے ساتھ وسیع القلبی کا سلوک کرتے ہوئے ان کو تعلیم وتربیت دیں اور ان کے مقام کو معاشرہ میں اونچا کریں چنانچہ ان سے اگر وہ شادی کرنا چاہیں تو ان کو پہلے غلامی سے آزاد کریں اب ہر کنیز، اُم لعنی ماں کا درجہ لے لیتی ہے، آزاد کردہ غلام اور باندی کو حق ولاء حاصل ہو جاتا ہے۔ ولاء کو قرابت اور عزت میں وہی مقام حاصل ہے جو نسبی قرابت ورشتہ کو حاصل ہوتا ہے بلکہ انہوں نے یہ بھی سنا تھا کہ رسول امین ﷺ نے آقاؤں پر یہ بھی حرام کیا ہے کہ وہ ان کو اپنا غلام سمجھیں یا ان کو بدنما الفاظ والقاب سے تکلیف دیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کی تھی کہ یہ کوئی شخص نہ کہے کہ "میرا غلام، میری باندی" بلکہ اس طرح کہے، میرا نوجوان یا عورت یا لڑکا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ "جس شخص کے پاس باندی ہو، وہ اسے بہترین تعلیم وتربیت دے، آزاد کرے اور پھر اس سے نکاح کرے تو اس کو دوگنا ثواب حاصل ہوتا ہے"

کابل کے قیدیوں کو یہ سب کچھ معلوم تھا وہ مدینہ میں اس طرح داخل ہوئے گویا فاتح ومنصور ہیں اور ایک باعزت سلوک کے معاشرہ میں دیے جانے والے ہیں اب ان کو فارس کی حریت، کسریٰ کی عدالت اور دین قدیم کے حقوق کے مقابلہ میں کہیں بہتر حریت وحقوق ملنے والے تھے۔ فارس کی عورتیں اس حالت میں خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کے دربار میں لائی گئیں کہ وہ خود مردوں کا اپنے لئے انتخاب کر رہی تھیں اور اپنی قیمت خود چکا رہی تھیں اب ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے یہ صدا پھوٹ رہی تھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

قیدی فروخت ہو چکے، ان کی قیمت بھی بیت المال میں داخل ہو چکی، ہر شخص اپنے اپنے خرید کردہ غلام یا باندی کو اپنے ہمراہ لے کر بارگاہ خلافت سے جا چکا ہے لیکن ابھی یزدجرد بن کسریٰ کی بیٹیاں باقی ہیں، وہ اس قدر قیمتی ہیں کہ کسی میں ان کی قیمت ادا کرنے کی قوت نہیں۔ یہ تین شہزادیاں ہیں سرزمین کسریٰ میں جن کا جواب نہ تھا، حضرت عمرؓ نے لوگوں کو ان شہزادیوں کے خرید لینے کی بھی اجازت دے دی۔ نگاہیں ان شہزادیوں کی طرف اٹھیں یہ کسریٰ کی ناز ونعم میں پلی ہوئی لڑکیاں ہیں جن کو آج ذلت نے شکستہ کر دیا ہے اور جن کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ رہے تھے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ان کو حضرت علیؓ جو اس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے نے دیکھا شہزادیوں کی اس حالت زار پر ان کا دل بھر آیا حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا۔ شہزادیوں کے ساتھ دیگر لڑکیوں کا سا سلوک کرنا مناسب نہیں۔ حضرت عمرؓ بولے "پھر تم ہی کچھ ان کے بارے میں مشورہ دو" حضرت علیؓ نے فرمایا "ان کی خوب بھاری قیمت لگائی جائے اور ان کو اختیار دیا جائے کہ یہ جس شخص کو چاہیں انتخاب کر لیں" حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا۔ قیمت لگنی شروع ہوئی۔ قیمت چڑھتی ہی چلی گئی آخر لوگ آگے بولی دینے سے رک گئے۔

لوگ خاموش ہو گئے تو ان کے چلے جانے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا میں ان کی قیمت ادا کر دوں گا چنانچہ آپ نے گراں ترین قیمت ادا کی جو بیت المال میں داخل کر دی گئی پھر ان شہزادیوں کو حق انتخاب دے دیا گیا۔ ان تینوں نے قریش کے تین نوجوانوں کا انتخاب کیا۔ یہ سب نوجوان سردار اور مرد میدان تھے۔ ایک نے ان میں سے عبداللہ بن عمر بن خطابؓ کو انتخاب کیا۔ دوسری نے محمد بن ابی بکر صدیقؓ کو اور تیسری شرم وحیا کی پیکر نگاہیں نیچے کئے اٹھی اور چند قدم چل کر اپنا ہاتھ اپنے بلند نصیب کی طرف اٹھانے لگی اس نے ایک نوجوان کے سر پر ہاتھ رکھا جو حضرت عمرؓ وحضرت علیؓ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ شہزادی کی طرف سے یہ اس نوجوان کا استقبال واعزاز تھا۔ یہ نوجوان حسین بن علی تھے اور یہ شہزادی شہر بانو یزدجرد بن شہریار کی بیٹی تھی۔ اس انتخاب پر حضرت علیؓ بن ابی طالب نہایت مسرور ہوئے اور آپ کا چہرہ نور چمکنے لگا۔ اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ سے فرمایا۔ ابو عبداللہ مبارک ہو تم اس کے ذریعہ روئے زمین پر سب سے بہترین اولاد کے باپ بنو گے۔

شہر بانو کو حضرت حسینؓ اپنے ہمراہ گھر لے آئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہزادی کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ اس کی تقدیر نے یاوری کی ہے۔ اگر وہ قیدی اور راندہ عیش وعشرت نہ بھی ہوئی ہوتی اور اس کو اپنے شریک زندگی کا حق دیا جاتا تو اس وقت بھی وہ اسی نوجوان کو انتخاب کرتیں اس سے بہترین انتخاب وہ نہ کر سکتی تھی، کیونکہ حسینؓ اس صاحب رسالت کا نواسہ ہے کہ جس نے تمام دنیا کو خدا نے خیر کی

طرف بلایا اور اس کی والدہ فاطمۃ الزہرا اسی رسول کی صاحبزادی تھیں اگر تمام روئے زمین کی عورتوں میں دیکھا جائے تو اس جیسی مقدس عورت نہ ملے گی۔ اس نوجوان کے والد حضرت علی ؓ بن ابی طالب ہیں جنہوں نے خلیفہ کی مجلس میں ہماری قدر و منزلت میں اضافہ کیا، ایسا اضافہ جس کے سامنے آزاد و کنیز تمام عورتوں کی عزت ہیچ ہے، پھر ہم تینوں شہزادیوں کو بہترین خاوندوں کے انتخاب کا حق دے کر ہم سب پر بے انتہا احسان کیا۔

کچھ زیادہ دن نہ گزرے کہ شہزادی مسلمان ہوگئی۔ اس کے بعد غلامی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک آزاد دلہن تھی۔ حضرت حسین ؓ نے اس کو اسلام کی حسن تعلیم کا وہ زیور پہنایا کہ وہ مدائن کے تخلات اور کابل کی شاداب وادیوں کو بھی بھول گئی۔ شہر بانو اب ایک نازنین بیوی، حضرت حسین ؓ کے گھر کا آفتاب، ہرنی کی طرح آزاد، اور عطر کی خوشبو کی مہک تھی۔ غزالہ سلافہ خولہ نام و لقب دیئے گئے۔ حسین ؓ، نواسۂ رسول سے شادی ہو جانے کے بعد دلہن کی خوشیاں ماضی کا بہترین بدل بن کر لوٹ آئی تھیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس سے بھی بڑھ کر۔

غزالہ صاحب الرائے، ذہین و عاقل لڑکی تھی۔ اسلام نے اس کے فضائل و کمالات کو اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ اس کے علم و فہم میں فقہ اور دیگر اسلامی علوم کا اضافہ ہو چکا تھا غزالہ کی خواہش تھی کہ حضرت حسین ؓ کی اولاد سے اس کی گود بھرے تاکہ باہمی رشتہ محبت کو مزید استواری نصیب ہو اور سادات عرب کی نظروں میں سادات عجم کی قدر و منزلت کے کچھ اسباب وسائل وجود میں آجائیں۔ اس طرح تمام اونچ نیچ اور باہمی امتیازات کی وہ حدیں درمیان سے اٹھ جائیں جو دونوں قوموں کے درمیان حائل ہیں جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا "لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ غزالہ کو امید تھی کہ خداوند تعالیٰ حسین ؓ کی اولاد میں سے اسے ایک ایسا لڑکا عطا کرے گا جس کے سامنے عرب و عجم کے تمام انسان بیک وقت عقیدت و محبت کی نگاہیں خم کر دیں گے۔ وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی تھیں، لوگ بدل گئے، زمانہ نے آنکھیں پھیر لیں، دلوں میں فرق آ گئے لیکن حضرت حسین ؓ کی خوش معاملگی میں غزالہ نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ اس کا تمام وقت حضرت حسین ؓ کی معیت میں عیش و کامرانی کا دور ثابت ہوتا رہا۔ غزالہ نے مزید گریہ وزاری اور انتہائی بے قراری کے ساتھ خدا سے اپنی مراد مانگی حتیٰ کہ دعا قبول ہوئی اور حضرت حسین ؓ کے گھر میں غزالہ کے بطن سے چاند سا خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اس میں حضرت حسین ؓ کی شباہت تھی اور ان ہی کے چہرے کی سی رونق تھی نیز ماں کا سا انکسار اور بھولا پن جمال آرا تھا۔ غزالہ کی مسرتیں اور آنکھوں کی ٹھنڈک بیان سے باہر تھیں۔ اس نے نومولود کا نام علی رکھا۔

حضرت حسین ؓ کے یہاں لیلیٰ بنت ابی مرہ کے بطن سے ایک اور لڑکا بھی تھا اس بچے کا نام بھی علی تھا لیکن غزالہ کی عرصہ سے آرزو تھی کہ اس کے بچہ ہوگا تو وہ اس کا نام علی رکھے گی۔ حضرت حسین ؓ نے بھی غزالہ کی تجویز کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کو والد ماجد سے اس قدر محبت تھی کہ صاحبزادوں کے ناموں میں علی کی تکرار سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے اسی طرح غزالہ بھی اسی نام میں حضرت علی ؓ کے جمال اور ان کے اس احسان کو یادگار کی حیثیت میں برقرار رکھنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کو اور اس کی بہنوں کو تاج عزت پہنایا تھا اور لوگوں میں فروخت ہونے سے بچا لیا تھا اور خلفاء کے گھروں کی بہو بیٹیاں بنایا تھا۔ غزالہ نے حضرت علی ؓ کے فضل و احسان کے شکریہ میں نومولود کا نام علی بن حسین ؓ تجویز کیا اور خدا کا شکر بجالائی کہ جس نے اس کی دعا کو قبول فرمایا۔

علی بن حسین ؓ حسن و جمال میں لاثانی تھے لیکن کمزور و ناتواں پیدا ہوئے تھے۔ نگاہوں میں لطیف قسم کی چمک تھی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ غم میں بجھی بجھی سی ہیں نگاہوں کی یہ شکستہ کرنیں آنے والے الم ناک حادثہ کی خبر دے رہی تھیں۔ علی بن حسین ؓ کی والدہ غزالہ کو زچگی میں شدید بخار ہوا حضرت حسین ؓ نے تیمارداری اور علاج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا لیکن بخار کی آگ کو ہزار کوششوں کے باوجود بجھا نہ سکے۔ غزالہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو رہی تھی کہ گویا اپنی تمناؤں کی دنیا "علی بن حسین ؓ" کو حسرت سے ٹپکتے ہوئے موتیوں کا ہار پہنا کر الوداع کہہ رہی ہے۔

علی اصغر اب حسین ؓ کی ایک آزاد شدہ کنیز کے حوالہ کر دیئے گئے یہ کنیز حضرت حسین ؓ کی ام ولد تھی، جس نے علی اصغر کو اپنا دودھ پلایا اور ایک رحم دل ماں جس طرح اپنے لخت جگر کی خبر گیری کرتی ہے اسی طرح یہ اس بچے کی پرورش پر متوجہ ہوئی۔ علی اصغر کو مرنے والی ماں، حقیقی ماں کے حالات و واقعات سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔ ان کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ زمانہ شعور میں بھی ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میری حقیقی والدہ فوت ہو چکی ہے۔ وہ اس ام ولد کو امی کہہ کر پکارتے اور وہ ان کو جواب میں بیٹا کہتی، یہ بے خبری اتفاقی واقعہ نہیں تھا، بلکہ تمام اہل خانہ میں طے شدہ منصوبہ کے ماتحت والدہ کی وفات کے واقعہ کو ان سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان کے ننھے منھے دل کو احساس غم سے محفوظ رکھا جائے۔

کم سنی ہی میں احساس شعور، بزرگوں کا ادب اور بڑوں کے حقوق کا پاس انہیں اس قدر تھا کہ جب کچھ بڑے ہوئے تو محسوس کیا کہ عام طور پر ماؤں کا جو رویہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے میری والدہ کا معاملہ اس شفقت وعنایت میں بہت آگے ہے حتیٰ کہ جب دونوں کا کھانا تیار ہو کر آتا تو والدہ بغور کھانے کو ملاحظہ کرتی ہیں اور پھر اس وقت تک کھانا کو ہاتھ نہ لگاتی جب تک بچہ اپنا من پسند کھانا اس میں سے کھا نہ لے، بچے نے شدت سے اس امر کو محسوس کیا اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا، ماں نے ہمراہ کھانے کے لئے بلایا، اصرار کیا گھر والوں نے برا بھلا کہا لیکن بچے نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

گھر والوں نے وجہ پوچھی کہ تم تو بڑے باادب بزرگوں کا احترام کرنے والے بچے ہو پھر کیوں ماں کا حکم نہیں مانتے؟ جب ہر چہار طرف سے بوچھاڑ ہوئی اور وجہ بتلانے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا تو کہا "میں ادب وتہذیب کے خلاف سمجھتا ہوں کہ جس کھانے پر میری ماں کی نظر پڑ چکی ہو، میں وہ کھانا ماں سے پہلے کھاؤں، ہوسکتا ہے اس میں کوئی چیز ماں کے لئے مرغوب ہو لیکن وہ اس کو میری خاطر نہ کھا رہی ہوں۔ ایسی صورت میں میرا اس چیز کو کھانا صریح طور پر ماں کی نافرمانی کرنا ہوگا۔

پاکیزہ قلبی، اطاعت اور علم وحافظہ کے لحاظ سے وہ دور، تاریخ اسلام کا زریں دور تھا۔ قلب وگوش، مجالس علمیہ کی طرف اس طرح وقف تھے گویا پانی کی سطح پر فضا میں کوئی پرندہ معلق ہے، علم از خود دلوں میں اتر رہا تھا۔ عمر اور شعور کی قید نہ تھی، چھوٹے بڑے سب ہی پروانہ وار علمی حلقوں کی طرف کھنچے رہے تھے، مدینہ کی مسجد صحابہ اور پاکیزہ دل تابعین کے اولین گروہ سے معمور تھی۔ یہ حضرات قرآن وحدیث کے مذاکروں میں یا مسلسل نماز روزوں میں مشغول رہتے، اس مسلسل انہماک سے ان کے جسم لاغر اور ان کی آنکھوں کے حلقوں میں گڑھے پڑ گئے تھے، ساری ساری رات عبادت کے بعد دن کو وہ حضرات پراگندہ بال غبار آلود اور زرد رنگ دکھائی دیتے، ان کی پیشانیوں پر سجدوں کی کثرت سے گھٹے پڑے ہوئے تھے، وہ تمام رات بیدار رہ کر کتاب اللہ کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے، ان کے پاؤں اور پیشانیاں اسی حالت میں آرام وراحت پسند کرتی تھی۔ ذکر الٰہی کے وقت وہ اس طرح جھومتے جس طرح ہوا سے درخت جھومتا ہے۔ ان کی آنکھوں سے اس کثرت سے آنسو جاری ہوتے کہ ان کے کپڑے اور محن مسجد آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔ حضرت علی بن حسین ؒ فرماتے ہیں، "خدا کی قسم وہ لوگ اس وقت ہر چیز سے غافل ہو جاتے"

اپنے دوسرے بھائیوں اور چچیرے بھائیوں کے ہمراہ ان کے قدم مسجد نبوی کی طرف اٹھنے لگے، عمر ابھی دس سال کی بھی نہ ہوئی ہوگی، کہ قرآن وحدیث کی تشریحات سے کان آشنا ہونے لگے، اپنے والد حضرت حسین ؓ اور دیگر صحابہ وتابعین کی علمی مجلسوں میں آمد ورفت ہونے لگی طلب علم کا شوق ابھرنے لگا۔ کبھی اپنے چچا حضرت حسن ؓ کی علمی مجلس میں حاضری دیتے اور کبھی جابر بن عبداللہ انصاری، ابن عباس، مسور بن مخرمہ، ابوالحسین ہاشمی مدنی اور ابن عمر وغیرہ کی خدمت میں پہنچتے، بسا اوقات اپنی ماں آزاد شدہ کنیز کے ہمراہ امہات المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہاں ان کو بہت کچھ علمی باتیں اور روایات رسول اللہ ﷺ معلوم ہوئیں۔

علی بن حسین ؒ اس کو بھی معیوب نہ خیال کرتے کہ تابعین کی مجلسوں میں علم وحدیث کے استفادہ کے لئے حاضر ہوں، چنانچہ بکثرت مختلف درس گاہوں میں پہنچے اور ہر وقت اپنی طبیعت کو علم اور اہل علم کے لئے کشادہ پایا، علمی بات جہاں سے حاصل ہوتی اور ان کو حق وصدق اس میں نظر آتا تو بے تکلف اس کو اخذ کر لیتے، وہ بلا وجہ کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیتے، حضرت علی بن حسین کی علمی مہارت، نور بصیرت اور ذہانت، حقیقت میں نبی اکرم ﷺ کے علم وفضل کا ورثہ تھی، جس سے انہیں پورا پورا حصہ ملا تھا۔ وہ بہت سرعت کے ساتھ ایک امام وقت کے مقام کی طرف ترقی کر رہے تھے، وہ وقت تقریباً آچکا تھا کہ رائے، اجتہاد، تصدیق وتضعیف اور تصحیح وتغلیط میں مرجع خلائق بنیں، علمی شعور، ادراک، حفظ وسماع، فکر واستنباط نے ان کو اب بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا۔

ان کا قلبی رجحان، دلی گرویدگی اور عشق کا ساسوز قرآن کے لئے وقف تھا، وہ اس کو پڑھتے، ان کے اسرار ونکات سمجھتے اور ہر تحقیق کو اس کے اصل مقام پر موڑ دیتے، ان کا دل قرآن میں ایک لوح مکتوب اور صحیفہ محفوظ بن گیا تھا، اس کا کوئی لفظ اور کوئی حرف ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا، وہ جس وقت اس کو پڑھتے تو خوف وخشیت سے لرزہ براندام ہو جاتے جس وقت آیات کی تشریحات اور ان کے وسیع مفہوم کی تقریر کرتے تو سننے والوں پر ان ہی کا سا خوف اور خشیت طاری ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قرآن صرف علی بن حسین ؒ ہی کو یاد ہے اور سب لوگ بھولے ہوئے ہیں۔

آپ کو کسی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان کو جس ماں نے جنم دیا تھا وہ زچگی کی حالت ہی میں دنیا سے کوچ کر چکی ہے۔ یہ ماں جو ان کی

پرورش کی ذمہ دار ہے، درحقیقت ان کے والد کی ام ولد ہے۔ وہ اس نیک شعار منہ بولی ماں کے احسان وشفقت پر حیران تھے کہ اس کے باوجود وہ ان کے لئے آنکھیں بچھاتی ہے، حالانکہ وہ اس کے لختِ جگر نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپ کو محسوس ہوا کہ وہ ان کنیزوں کے احسان وسلوک کی وجہ سے ان کے مقروض ہیں، لازم ہے کہ عمر بھر اپنی طاقت ان کی دل جوئی اور آرام کے لئے وقف کردیں، بلکہ یہ معلوم ہوکر ان کی اس محبت میں اور بھی اضافہ ہوا کہ ان کی حقیقی والدہ شہر بانو جو قید ہوکر آئی تھیں وہ بھی کنیز تھیں، ان کی یہ مسرت تکبر، فخر بازی سے خالی تھی جب کہ انہیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ شہر بانو ایک شہزادی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے دادا حضرت علی ؓ بن ابی طالب ان عورتوں کو باعزت بنانے اور لوگوں پر ان کی قیمت کو بلند تر کرنے میں بے حد کوشاں تھے۔ حضرت علی ؓ نے شہر بانو کو حسین ؓ کی دلہن بنانے میں ایک ایسے وقت میں نہایت کامیاب پارٹ ادا کیا جب کہ فاتحین ان کو دور دراز علاقوں سے غلام بنا کر لانے میں مصروف تھے۔

اس طرح اس کی نظریں غلاموں اور باندیوں کے مسئلہ پر جم کر رہ گئیں، ان کے دل نے محسوس کیا کہ غلاموں اور احرار کے درمیان مساوات قائم ہونی ضروری ہے۔ اس خیال میں اس وقت اور بھی پختگی ہوئی جب کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ دینِ اسلام، مساوات کا علم بردار ہے۔ انہوں نے عزم کرلیا کہ وہ کسی کو بھی اس کے نام کے علاوہ اور کسی لقب سے نہیں پکاریں گے، وہ کسی غلام کی کسی نازیبا حرکت اور باندی کے کسی قصور پر ناراض ہوکر کبھی ان کو سزا نہیں دیں، گے انہوں نے اپنے دل میں قسم کھائی کہ نہ صرف مدینہ بلکہ دنیائے اسلام کے ان کے بازاروں میں پہنچ کر کہ جن میں ان انسانوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے، غلاموں اور باندیوں کو خرید خرید کر آزاد کریں گے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوگا وہ اس رسم کو ختم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔

حضرت حسن ؓ کی وفات پر گویا مدینہ کے در وبام میں زلزلہ آگیا اور اس وقت تو لوگ حیران ہی رہ گئے جب معلوم ہوا کہ یزید تختِ سلطنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ علی بن حسین صرف در وبام کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے آخری کناروں کو گویا دیکھ رہے تھے کہ وہ بھی مدینہ کے ساتھ ساتھ لرز رہے تھے، لیکن یہ احساس شکست براہِ راست مدینہ کو بہ نسبت دوسرے شہروں کے اپنی لپیٹ میں زیادہ لیے ہوئے تھا۔ حکام وولاۃ کا استبداد ناقابل برداشت تھا اور ان کا سیاسی مکر ہر طرف تسلط جمارہا تھا۔ علی نے اپنے والد حضرت حسین ؓ کو دیکھا کہ وہ نہایت سختی سے یزید کی تولیت کا انکار کررہے ہیں اور یزید بھی انتہائی طور پر حضرت حسین ؓ کے اس انکار پر سراسیمہ ہے۔ آگ کے ان شعلوں میں تمام اہل بیت جن میں علی بھی ہیں، برابر کے شریک تھے، مرد، عورتیں، آزد، غلام کون تھا جو یزید کی اس ناپاک بساطِ سیاست پر جذباتِ انتقام سے بھرا ہوا نہیں تھا، یزید وہ شخص تھا جس سے امت کے لئے بھلائی اور بہبودی کی امید قائم نہ کی جاسکتی تھی۔

علی بن حسین ؓ موالی کے منتقمانہ جذبات پر جو ان تھے کہ وہ امراء پر سبقت لے گئے، وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بھی ہماری ہی طرح انسان ہیں، جو قومی فلاح کی ترقی اور شر کا سر کچلنے میں کسی طرح ہم سے پیچھے نہیں ہیں، عربی عجمی میں کوئی فرق نہیں، بلکہ موالی حریت کے زیادہ محتاج ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی غلامی کے بندھنوں کو توڑ کر انہیں تاریک غاروں سے باہر لایا جائے۔

غرض باندی، غلام، جوان لڑکے اور لڑکیاں، کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان بچوں اور حرم کی خدمت کرنے کے لئے حضرت حسین ؓ کے ساتھ ملنے کا مشتاق نہ ہوا ہو علی بن حسین نابالغ ہم عمروں کے لئے اور اپنے ہی جیسے بنی ہاشم کے دوسرے لڑکوں کی طرح اس قافلہ میں شریکِ سفر تھے، وہ اس وقت قریب البلوغ تھے یا سنِ بلوغ میں قدم رکھ چکے تھے۔ بہر حال جس وقت یہ جنگ ختم ہوئی۔ اس وقت زندہ رہنے والے بچوں میں وہ سب سے بڑی عمر کے تھے۔

خدائی حفاظت:

علی اصغر، اپنے خدا کی حفاظت والد اور اہل بیت کے ہمراہ اونٹوں کے پالانوں اور گھوڑوں کی پشت پر سفر کررہے تھے کہ اچانک ان پر بیماری کا حملہ ہوا، بدن گرنے لگا، حتیٰ کہ بیماری نے بالکل ہی ناچار بنا کر بٹھادیا۔ وہ اپنے بستر پر ہر چیز سے غافل لیٹے رہتے، گاہے گاہے آنکھ کھول کر دیکھ لینے کے سوا ان کو اپنے ماحول کی کچھ خبر نہ رہی، ایک عرصہ کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک خیمہ میں فروکش ہیں، جس میں ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی ہے یا باہر کی جانب سے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ آپ کی پھوپھی زینب نے بیماری کی شدت وتکلیف محسوس کرتے ہوئے تیمارداری کی طرف توجہ دی۔ وہ جس وقت جنگ کا خونیں منظر دیکھتی تھیں تو ان کو مستقبل کے پردے پر کچھ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ خاندانِ اہل بیت میں شاید صرف یہی مریض زندہ رہ جائے گا۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں تمنا بھی یہی تھی کہ کم از کم یہی بچہ سلامت باقی بچ جائے، شاید یہ مرض اس کے لئے بچاؤ کا بہانہ ثابت ہورہا ہے تاکہ حسین ؓ کی نسل زندہ رہے۔ وہ مریض پر جھکی ہوئی اس کی دیکھ بھال کرنے، دلاسا دینے اور اس کے لئے پانی محفوظ رکھنے میں مشغول تھیں کیونکہ مریض بچہ تھا، معلوم نہیں کس وقت اسے پانی کی ضرورت پڑ جائے۔

حضرت حسینؑ نے دیکھا کہ بیماری کا شدید حملہ ہے، چاہا کہ صاحبزادہ سے تکلیف کو کچھ ہلکا کردیں، فرمایا۔ "بیٹا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟ طلب کرو"! عرض کی، "ابا جان! بس میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اللہ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ وہ خود ہی ان کے لئے تدابیر کرتا ہے۔ اس بات پر حضرت حسینؑ نہایت خوش ہوئے، آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوئی اور فرمایا: "بیٹا! تم نے بہت اچھی بات کہی، جبرائیل نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ کوئی حاجت ہو تو فرمائیے، پوری کروں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں اللہ پر نظر رکھتا ہوں وہی میرے لئے کافی اور کارساز ہے۔ تمہاری اس بات میں ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ کے قول کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔

بالآخر جنگ کا یہ ہولناک قصہ ختم ہوا۔ عبیداللہ بن زیاد کے سامنے حضرت حسینؑ کا سر لاکر رکھا گیا، عین اسی وقت اس کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا، عبیداللہ بن زیاد اور اس کے ان تمام دوستوں کو جو اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، دستر خوان پر بلایا گیا تھا۔ ابن زیاد کھانا کھا رہا تھا اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ علی بن حسینؑ اس وقت وہاں موجود یہ تمام ماجرا دیکھ رہے تھے۔ ابن زیاد نے ان کی طرف التفات کیا، ان کے دل میں بھوک کی وجہ سے خیال آیا کہ خوشبوؤں میں مہکتے ہوئے اس کھانے میں، میں بھی حصہ لوں۔

طبیعت میں کھانے کی طرف رغبت پیدا ضرور ہوئی لیکن انہوں نے فوراً ہی اپنے والد بزرگوار کو یاد کیا جبکہ شہادت سے کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے ان سے استفسار فرمایا تھا کہ تمہارا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ یہی جی چاہتا ہے کہ کسی چیز کو جی نہ چاہے" مگر اس وقت دھڑکتے ہوئے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ایک روز ایسا بھی آجائے کہ ان کے سامنے ابن زیاد کا سر لایا جائے اور وہ بھی اس وقت لوگوں کو کھانے پر مدعو کئے ہوئے ہوں۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ بچے کے دھڑکتے ہوئے دل کی یہ تمنا پھڑکتے لبوں پر دعا بن کر رکی۔ اس نے اپنے رب سے سرگوشی کے انداز میں اپنی دلی آرزو پیش کی اور عرض کیا، اے رب! مجھے بھی میری زندگی میں ابن زیاد کا کٹا ہوا سر دکھا جبکہ میں بھی اسی طرح اس وقت کھانا کھانے میں مشغول ہوں۔

یزید نے جس وقت اہل بیت کو مدینہ واپس جانے کا حکم دیا۔ اس وقت نماز با جماعت کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد نمازیوں سے دیکھتے دیکھتے بھر گئی۔ علی بن حسینؑ اور ان کے ارد گرد بنی ہاشم کے دوسرے بچے نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ ہر طرف سے ان ننھے نمازیوں پر لوگوں کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ آپس میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اپنی تمنا کا اظہار کیا کہ علی بن حسین سے کچھ تقریر سننی چاہئے۔ یہ آرزو یک بارگی تمام نمازیوں میں سرایت کرگئی۔ یزید کے کان میں آہستہ سے عرض کی گئی کہ لوگوں کی خواہش ہے کہ علی بن حسینؑ سے کچھ سنا جائے۔ کاش آپ اجازت دے دیں۔

لوگوں کی خواہش اتنی زبردست تھی کہ یزید کو مجال انکار نہ رہی۔ بادل ناخواستہ وہ اجازت دینے پر مجبور ہوگیا، مگر اس کا خیال تھا کہ علی بن حسینؑ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف منہ سے نہ نکالیں گے بلکہ اسے امید تھی کہ میں نے جوان لوگوں پر احسان کرتے ہوئے چھوڑ دیا ہے یہ اس پر اظہار تشکر کریں گے، غرض ہاشمی نوجوان کو منبر کی سیڑھیوں پر چڑھا دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بچہ منبر کے بالائی حصہ پر سنبھل بیٹھا، اس کے عظمت و جلال سے لوگ خاموش تھے، ان کے سانسوں کی آمد و رفت گویا منقطع ہوگئی تھی۔ علیؑ نے تقریر کی اور بڑی لمبی تقریر سے لوگوں کو خطاب کیا۔ خاصہ طویل وقت لوگوں پر اس طرح گزر گیا کہ کسی کو وقت کا احساس تک نہ ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وقت کی رفتار بھی مدھم پڑگئی ہے، لوگ برابر متوجہ تھے ان کی مزید خواہش تھی کہ بچہ کی آواز کو دوسری کوئی آواز بند نہ کر پائے کیونکہ انہیں پہلی بار آج ایک سچی آواز کی گونج اور شیریں بیان سننے کا موقعہ ملا تھا۔

علی بن حسینؑ تقریر کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کے سامنے اہل بیت میں سے ایک ایک مفاخر و فضائل اور ملت اسلامیہ پر ان کے احسانات گنوا رہے تھے، وہ برابر بولتے گئے حتیٰ کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی، قریب تھا کہ تمام مجمع دھاڑیں مار مار کر رو پڑے، یزید کو اس خلاف توقع صورتِ حال سے بڑی پریشانی ہوئی اور تو کوئی تدبیر اس سے بن نہ آئی اس نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیا تاکہ تقریر آگے نہ بڑھ سکے۔ شاہی حکم پاتے ہی مؤذن پکارا "اللہ اکبر، اللہ اکبر"

علی بن حسینؑ جو اس وقت بھی منبر پر ہی بیٹھے تھے بولے، "بیشک کوئی چیز اللہ سے بڑی نہیں ہوسکتی۔"

پھر مؤذن نے وقفہ کے بعد کہا، "اشھدان لاالٰہ الا اللہ ."

علی:۔ بے شک میرے دل، خون، گوشت اور تمام ہوش و حواس کی بھی یہی شہادت ہے۔

مؤذن:۔ اشھد ان محمد رسول اللہ

علی نے یزید کو مخاطب کر کے پوچھا "یزید! بتا یہ میرے نانا تھے یا تیرے؟" "اگر تو کہتا ہے،" کہ میرے نانا تھے" تو تو جھوٹا ہے اور اگر تسلیم کرتا ہے کہ واقعی میرے نانا تھے تو بتا کہ پھر تو نے کیوں رسول کی ذریت کو ذبح کیا؟" یزید ایسا بوکھلایا کہ کوئی جواب نہ دے سکا، موذن نے اس عرصہ میں اذان پوری کر لی تھی، علی منبر سے نیچے اتر آئے اور خدا کے حضور دست بستہ ہونے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

حضرت حسین ؑ کی نرینہ اولاد میں سے تنہا علی ؑ ہی تھے جو زندہ مدینہ واپس پہنچے تھے۔ ان کے سر پر اب سوائے خدا کے کسی کا سایہ نہ تھا۔ خدا ہی کا ہاتھ تھا جو ان کی طرف بڑھا، ان کی حفاظت وحمایت کی اور نجات بخشی حالانکہ ان کے بھی شہید ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ چنانچہ کربلا کے واقعہ کے بعد ابن زیاد اور خود یزید اس پر معترض تھے کہ یہ لڑکا کیوں زندہ بچ گیا۔ لیکن ان پر خدا کا سایہ تھا بیماری اور جسمانی ضعف کے پردے ان کے لئے ساتر بن گئے۔ دشمنوں کی آنکھیں ان کی طرف سے اندھی ہو گئیں اور ان کے دلوں کی خواہش پر پتھر رکھ دیا گیا جب یہ پردہ ان سے ہٹا تو دنیا کو خدا کی حکمت اور اس کا ان پر احسان فرمانا سمجھ میں آ گیا۔

علی موت سے نڈر واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے واقعہ کربلا کے دن بھی اپنی پھوپھی زینب سے لاٹھی اور تلوار طلب کی تھی۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنے والد کی جان بچانے کے لئے ان پر قربان ہوتے ہوئے ان سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ لیکن والد نے فرمایا تھا: "تم لاٹھی اور تلوار لے کر کیا کرو گے"؟ عرض کیا "تلوار سے لڑوں گا، اور لاٹھی پر اپنے کمزور جسم کو سہارا دوں گا"۔ بات یہ تھی کہ علی والد اور دیگر اہل بیت کے بعد جینا نہیں چاہتے تھے۔ اس اندوہناک واقعہ کے بعد مدت العمر کسی نے ان کو مسکراتے یا ہنستے نہیں دیکھا۔ ان کی حالت اب اس گوشہ گیر زاہد و عابد کی سی ہو چکی تھی جو دنیا سے بالکل بے واسطہ ہو گیا ہو، لیکن علی ؑ نے خدا کی مرضی پر شکر کیا، حیات، موت، صحت اور بیماری تمام حالتوں کو اسی کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے ہوئے صبر و شکر سے کام لیا، انہیں محسوس ہوا کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی قدرت کی مستور حکمت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ سلامت رہیں، مدینہ واپس ہوں اور اپنے چچا حضرت حسن ؑ کی صاحبزادی فاطمہ سے شادی کریں تاکہ اہل بیت کا مقدس خاندان اپنی روایات کے ساتھ روئے زمین پر قائم رہیں اور زہر دیئے ہوئے شہید حضرت حسن کا گھرانا آباد رہے۔ سبحان اللہ! خدا کی کارسازی کا کیا کہنا!

علی بن حسین نے مرض و تکلیف کی نعمت اس وقت پائی جب کہ ان کے گھر والوں پر بنی ہوئی تھی۔ یہی بیماری آگے چل کر عافیت و آرام میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بیماری کی حالت میں خدا سے اس طرح دعا مانگ رہے تھے گویا تندرست ہیں، اور اب آرام و عافیت میں وہ اس طرح دعائیں مانگتے تھے گویا نیم جاں ہیں۔ ان کی بارگاہ الٰہی میں یہی درخواست تھی:۔

"اے رب تو نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا۔ اپنے احسانات کی مجھ پر بارش کی۔ میں اس امن کی حالت میں بھی تجھ کو پکارتا ہوں، اور مجھے تیرا ہی انس ہے، مجھے، نہ کوئی ڈر ہے نہ کوئی اندیشہ!

"اے رب! میری دعا اس بے کس کی طرح ہے جس کو بھوک اور فاقہ نے نڈھال کر دیا ہو۔ کمزوری اور بے تدبیری نے اسے عاجز و ناچار بنا دیا ہو، میں تجھے اب ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح پکارتا ہوں کہ جس کی مصیبت کو تیرے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔

اے میرے رب! میری طاقت جواب دے چکی، تدبیریں ناکام ہو چکیں، وہ افتاد مجھ پر پڑی ہے کہ جس کو میں سہار نہیں سکتا۔ مجھے اپنے اچھے احسانات کی طرف لوٹا، میں مخلوق سے مایوس ہو چکا، میرے پاس تیری امیدوں کے سوا کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔ اے رب! تو مجھ پر ہمیشہ سے احسان کرتا رہا ہے"۔

علی بن حسین مدینہ آئے تو اپنے گھر گئے اور پھر ام المومنین "ام سلمہ" کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ام سلمہ نے انہیں حضرت حسین ؑ کی امانت، صحف، وصایا اور اسلحہ واپس کئے۔ علی ؑ کی رائے ہوئی کہ ان تمام کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ اس قیمت سے انہوں نے اپنے والد حضرت حسین ؑ کا قرض ادا کیا۔

(حضرت حسین ؑ کو شہادت سے پیشتر قرض نے بہت زیر بار کر رکھا تھا۔ وہ کچھ اوپر ستر ہزار دینار کے مقروض تھے) وہ عموماً قرض اس لئے لیا کرتے تھے کہ امور خیر میں اور بیواؤں یتیموں اور مسکینوں پر صدقہ کریں۔ اگر کچھ مال باقی بچتا تو اس سے اونٹ خرید کر ذبح کرتے، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے اور دودھ پلاتے (حضرت حسین ؑ کی کچھ مملوکہ جائداد اور زراعتی زمین تھی جس کا خراج ادا کیا کرتے تھے) اس کے علاوہ زمانہ عمر ؓ سے بیت المال کی طرف سے وظیفہ بھی مقرر تھا۔ والد کی اس جائیداد میں سے علی بن حسین ؑ نے کچھ جائیداد فروخت کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس فروخت ہونے والی جائداد میں نجد کا چشمہ "عین نجدیہ" اور ایک دوسرا چشمہ "عین تحنس تھا" اس چشمہ کا پانی حضرت حسین ؑ کے غلام "تحنس" نے کھود کر نکالا تھا۔ علی بن حسین ؑ نے یہ چشمے ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے ہاتھ

فروخت کر دیئے اور اس قیمت سے حضرت حسین ؓ کا قرض ادا کیا (یہ وہی چشمے ہیں کہ جن پر بعد میں آل حکیم بن خرام کا وارثانہ قبضہ ہوا)

قرض کی ادائیگی سے فراغت ہوئی تو تمام فرصتیں، عبادت الٰہی، نماز، روزہ، اور زاہدانہ بود و باش کے لئے وقف ہو گئیں اور پھر وہی ماضی کے علمی شغل میں دلچسپی، حضرات صحابہ و تابعین کی علمی مجلسوں میں آمد و رفت شروع ہو گئی، حدیث، فقہ اور قیاس پر گرم گرم بحثیں ہونے لگیں، گفتگو ایسی آزادی کے ساتھ ہوتی تھی کہ اس میں اشخاص کا امتیاز بھی روا نہیں رکھا جاتا تھا کیونکہ علم سے بالاتر کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی۔

تابعین میں سے ایک بزرگ "زید بن اسلم ؓ" مسجد نبوی میں لوگوں کو علمی درس دیا کرتے تھے۔ یہ بزرگ ایک آزاد شدہ غلام تھے، لیکن ساتھ ہی علوم و فقہ میں مہارت کاملہ کے مالک تھے۔ ایک معلم ہونے کی حیثیت سے بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اکثر فقہ کا درس دیتے۔ علی بن حسین ؓ بکثرت ان ہی کے حلقہ درس میں شریک ہوتے۔ ایک روز نافع بن جبیر سے، علی بن حسین ؓ کی ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے: "تعجب ہے تم پر! تم سید زادے اور مخلوق میں افضل ترین ہوتے ہوئے اس غلام کی مجلس میں جا کر بیٹھتے ہو؟

علی بن حسین ؓ بولے:

"نافع! علم کی کوئی مقررہ منزل نہیں ہوتی اس لئے وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کی خاطر پہنچنا چاہیئے۔ نافع کچھ نہ بولے۔ گویا ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور جواب نہایت معقول معلوم ہوا۔ حقیقت میں علی بن حسین اپنے عمل و کردار سے علم اور موالی (غلام) دونوں کی قدر و منزلت میں اضافہ کے خواہشمند تھے۔"

علی بن حسین ؓ کی یہ علمی جستجو کبھی کم نہ ہوئی۔ اسی جذبۂ کاوش نے ان کو یکتائے روزگار بنایا اور علوم فقہ، قضا اور دانشمندی میں بے نظیر مقام بخشا۔ وہ نہ صرف اہل علم ہی تھے بلکہ عمل میں بھی سراپا نمونۂ رسول تھے۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ رات دن میں ہزار ہزار رکعتیں نوافل پڑھتے تھے۔ نوافل کے درمیان گریہ زاری، انابت الی اللہ اور دعا میں مشغول رہتے تھے۔ گھر والے بعض اوقات ان کی عبادت کی تقلید کرنا چاہتے مگر عاجز رہتے۔ علی بن حسین ؓ ان کو آرام کرنے اور ہمت سے زیادہ مشقت میں پڑنے سے باز رہنے کی فہمائش کرتے ہوئے فرماتے۔ "اپنی عادت و ہمت سے زیادہ خود کو گراں بار نہ کرو ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔"

عبادت و زہد میں چونکہ ان کی کوئی نظیر نہ تھا لہٰذا لوگوں نے انہیں "زین العابدین" کے لقب سے پکارا۔ ان کی پیہم سجدہ ریزیوں کو دیکھتے ہوئے ان کو "سجاد" کہا۔ سجدوں کا نشان ان کی پیشانی پر چمکا تو "ذوالثفنات" کہا گیا۔ ان کی کنیت "ابن الخیرتین" تھی کیونکہ والد کے واسطہ سے ان کی دو ددھیال رسول اللہ ﷺ سے اور ننھیال ایران کے شاہی خاندان سے ملتی تھی۔ اس کے علاوہ "سید العارفین" "الزکی الامین" القاب اور ابوالحسن، ابوبکر، ابومحمد ان کی کنیتیں تھیں۔

برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ ان کے پاس آتے اور نیک شگون سمجھتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو چھوتے۔ مسجد نبوی میں لوگ ان کو دیکھنے کے لئے آتے۔ نماز سے فراغت کے بعد آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو چومتے اور آنکھوں کو لگاتے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جس چہرے کو زین العابدین کے ہاتھ چھو لیں، وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے کبھی آشوب چشم یا آنکھوں میں دوسری کوئی تکلیف پیدا ہو سکتی ہے۔

پرانی تہذیب کے اثرات غلاموں اور کنیزوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ جس نظر سے شرفاء اور احرار دیکھے جاتے تھے وہ ان غریبوں کو نصیب نہ تھی۔ اہل علم، اہل الرائے اور آزاد ہو جانے کے باوجود بھی ان کو آزاد لوگوں کی طرح عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حضرت زین العابدین نے دیکھا کہ مدینہ والے حتیٰ کہ وہاں کے اہل علم اور محدثین بھی ان کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ انہوں نے اہل علم فصحاء اور محدثین، غلاموں اور مولاؤں کی مجلسوں میں صبح و شام حاضری دی۔ اس کا مقصد حصول علم کے علاوہ ان کی حوصلہ افزائی بھی تھی۔

اہل مدینہ امہات اولاد اور باندیوں کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ صرف مدینہ ہی میں تین ایسی باکمال عظیم ہستیاں تھیں کہ عراق، حجاز اور مدینہ میں ان کی نظیر نہ ملتی تھی۔ یہ تینوں باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، یہ تھے سالم بن عبداللہ بن عمر، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور علی بن حسین زین العابدین، یہ سب خالہ زاد بھائی اور یزدجرد کی لڑکیوں کی اولاد تھے، لیکن ان کی پرہیزگاری اور فقہ کا یہ حال تھا کہ ان کو تمام اہل مدینہ پر فوقیت حاصل تھی، چنانچہ اہل مدینہ نے باندیوں سے شادیاں کرنی شروع کیں کہ شاید ان کو بھی اس قسم کی اولاد نصیب ہو جائے۔

سعید بن المسیب اپنے زہد، علم، عقل اور بلا کی ذہانت کے باوجود باندیوں کی اولاد سے بھی اسی طرح پیش آتے تھے جس طرح وہ آزاد عورتوں کی اولاد سے ملتے تھے۔ حتیٰ کہ جب یہ تین باندی زادے بڑی عمروں کو پہنچ کر لوگوں کے سردار بن گئے تو دیکھا گیا کہ قریش میں سے

ایک نوجوان ان کی مجلس میں علم وفقہ حاصل کرنے کے لئے پہنچا، مگر اس کی ماں باندی تھی۔ سعید نے ایک روز اس نوجوان سے تعارف حاصل کرنے کے لئے پوچھا: ''تمہارے ننھیال خاندان والے کون لوگ ہیں؟'' قرشی نوجوان نے جواب دیا ''میری ماں کنیز ہے''۔

سعید بن مسیب سے قرشی نوجوان نے جب یہ ظاہر کیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سعید کی نظروں میں معمولی حیثیت کا آدمی سمجھا گیا ہے چنانچہ سعید نے اس کی جانب سے منہ پھیر لیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی۔ نوجوان کو سعید کا یہ سلوک بہت ناگوار گزرا، اس نے سعید کو قابل اعتنا نہ سمجھا، کوئی بات نہ کی اور سعید اس درمیان میں وہاں سے جانے لگے۔

سعید ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے سالم بن عبداللہ بن عمر نمودار ہوئے، سعید نے ان کی بہت مدارات کی۔ تپاک سے ملے، عزت کے ساتھ بٹھایا، کچھ دیر گفتگو رہی اور سالم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ جب وہ جا چکے، تو قرشی نوجوان نے ابن المسیب سے کہا ''چچا! یہ کون صاحب تھے جن سے آپ اس قدر تپاک سے ملے؟'' سعید نے جواب دیا، ''سبحان اللہ! کیا تم اپنی قوم کے اس جیسے ہیرو سے بھی ناواقف ہو؟'' ''یہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب تھے'' قرشی نے پوچھا ''ان کی والدہ کون تھیں؟'' سعید نے کہا ''ان کی والدہ کنیز تھیں''۔

قرشی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ سعید بھی خاموش ہو گئے۔ اسی عرصہ میں قاسم بن محمد بن ابی بکر بھی تشریف لائے۔ سلام کیا، ان سے بھی سعید بڑے ادب واحترام سے پیش آئے اور کچھ دیر بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔ نوجوان نے پھر سوال کیا: ''چچا! یہ کون تھے؟'' سعید بولے ''کیا تم اپنی قوم میں سے قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق جیسے شخص سے بھی ناواقف ہو؟'' قرشی نے کہا ''میں ان کے والد کے متعلق جانتا ہوں لیکن یہ بتایئے ان کی والدہ کون تھیں؟'' سعید نے جواب دیا ''ان کی والدہ کنیز تھیں''۔

کچھ دیر گزری تھی کہ سید الزہاد، زین العابدین علی بن حسین ؓ تشریف لائے۔ سعید کہا کرتے تھے: ''میں نے علی بن حسین ؓ سے افضل ترین انسان عمر بھر نہیں دیکھا۔ میں جب بھی انہیں دیکھتا ہوں تو خود پر حقارت آمیز نظر ڈالتا ہوں، ۔۔۔۔۔ غرض سعید نے جب علی بن حسین ؓ کو آتے دیکھا تو تعظیماً کھڑے ہو گئے، نہایت احترام وتکریم سے پیش آئے۔ پاس ادب سے گفتگو بھی پورے اجلال واحترام سے کرتے رہے، حتیٰ کہ امام زین العابدین بھی تشریف لے گئے۔ قرشی نے پھر اپنا سوال دہرایا ''چچا! یہ کون صاحب تھے؟'' سعید نے اس قرشی کی ناواقفیت اور جہالت پر ناگواری کے انداز میں جواب دیا ''یہ وہ ہستی ہے جس سے کسی مسلمان کو بھی ناواقف نہیں ہونا چاہئے! یہ تھے علی بن حسین بن علی بن ابی طالب!''

قرشی نے کہا ''میرا سوال ان کے والد کے متعلق نہیں۔ والدہ کے متعلق ہے'' سعید ایک ہی قسم کے مسلسل سوال کرنے سے نوجوان کے مقصد کو بھانپ گئے۔ جواب میں قدرے مسکراہٹ تھی، ''ان کی والدہ کنیز تھیں''

قرشی نوجوان: ''چچا! میں نے آپ کے سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ میں کنیز زادہ ہوں تو اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں آپ کی نظروں میں حقیر ہو گیا ہوں۔ کیا میرا معاملہ ان تینوں بزرگوں کے مشابہ نہیں ہے''؟ یہ سن کر سعید احساس ندامت سے کچھ بوجھل سے ہو گئے۔ اس کے بعد اس نوجوان سے پوری توجہ اور عنایت سے پیش آنے لگے۔ نوجوان اب محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ سعید کی نگاہ میں قدر ومنزلت کا مالک ہو گیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان تین کنیز زاد عظیم انسانوں کے فضل وشرف کے مقام کو لوگوں نے اس قدر اونچا پایا کہ مدینہ میں ان کو ان تینوں سے کوئی شخص بھی بلند تر نظر نہ آیا۔ اس طرح گویا حریت اور غلامی کے پلے برابر ہو گئے تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ غلاموں کا پلہ آزادوں سے بھی وزنی ہو گیا تھا۔ اس صورت حال میں اسلام نے لوگوں کو عجیب کشش کے ساتھ علم کا راغب بنا دیا تھا۔ مدینۃ الرسول میں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس ان علمی چشموں کا فیض نہ پہنچا ہو اور وہ اپنے اس علم پر فخر نہ کرتا ہو۔

زین العابدین ؓ فقر میں مرجع انام تھے۔ ان کے نہاں خانہ دماغ میں گویا علوم فقہی کے انبار لگے ہوئے تھے، وہ تمام اہل مدینہ میں سب سے بڑے فقیہ شمار ہوتے تھے۔ بڑے بڑے فقہاء کا ان کی طرف عام رجوع تھا۔ مختلف قسم کے معاملات پر اس وقت ان کے پاس استفتاء لایا جاتا تھا۔ جبکہ فقہائے وقت سے ان کا جواب نہ بن پڑتا تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ میں وقت کے زبردست فقیہ سعید بن المسیب تفقہ اور استفتاء میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔

عجیب معاملہ تھا کہ جب کسی مسئلہ پر فقہائے مدینہ کچی تلی بات کہنے میں قاصر ہو جاتے تو زین العابدین ؓ کی اس میں دوٹوک پختہ رائے ہوتی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مشہور امام حدیث وروایت، محمد بن مسلم عبیداللہ بن شہاب زہری دریائے جیحوں کے کنارے شام کے ایک

سرحدی مقام، مصیصہ میں عبدالملک بن مروان سے ملنے گئے۔ اس مقام کو اس نے عہد قریب ہی میں فتح کیا تھا۔ یہ انطاکیہ اور بلادِ روم کے درمیان طرسوس کے قریب ہی واقع تھا، عبدالملک یہاں پہلی مرتبہ وارد ہوا تھا اور وہاں کے مرغزاروں اور گھنے باغات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عبدالملک علم حدیث میں نہ صرف دلچسپی بلکہ اس علم میں خاصا درک رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اوقاتِ دست میں اس علم میں مذاکرہ بھی کرتا تھا تاکہ اس کی واقفیت میں اضافہ ہو۔ عبدالملک اپنے شاہی محل میں فروکش تھا۔ دربار اور صدر دروازہ کے درمیان کئی ڈیوڑھیاں تھیں اور ان پر حاجیوں اور فوج کا سخت پہرہ تھا۔ یہ ڈیوڑھیاں باریابی پانے والوں کے واسطے انتظار کا وقت گزارنے کے لیے قیمتی قالینوں سے آراستہ تھیں۔ دربار سے صدر دروازہ کا کافی فاصلہ تھا۔ جب کوئی شاہی فرمان کسی سے متعلق صادر ہوتا تو کافی مرحلوں سے گزر کر صدر دروازے تک پہنچتا۔

براہِ راست وہاں سے دربار کی کوئی بات نہ سنی جا سکتی تھی اور نہ بغیر اذن کے وہاں تک کسی کو باریابی ہو سکتی تھی۔ علمائے حدیث میں سے مختلف علما، ان ڈیوڑھیوں میں حسبِ مراتب اس کثرت سے بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا یہ سلسلہ صدر دروازہ تک پہنچتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے ایک علمی سوال اٹھایا گیا۔ جو تمام محدثین سے متنقل ہوتا ہوا دروازہ تک پہنچا، اس سوال پر زہری کے جواب کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ بادشاہ تک جب یہ جواب پہنچا تو اسے پسند آیا اور جواب دینے والے کو دربار تک پہنچنے کی اجازت نصیب ہوئی۔ زہری دربار میں پہنچے، کچھ دیر قیام کیا اور بہت سے مال کے ساتھ جو بطور انعام ملا تھا، واپس ہوئے۔

پھر انہیں مدینہ جانے کی اجازت مل گئی تو وہ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے، ہمراہ ان کے ایک غلام تھا۔ روانہ ہوتے وقت انہوں نے انعام میں ملا ہوا مال ایک تھیلے میں بند کر کے غلام کے حوالہ کر دیا۔ چونکہ مسافت کافی لمبی تھی۔ راستہ میں کسی منزل پر مال والا تھیلا دیکھا گیا تو وہ نہ ملا کیونکہ وہ کہیں گم ہو چکا تھا۔ زہری کو غلام پر شبہ ہوا۔ بہت کچھ ڈرایا دھمکایا، اس سے کہا گیا کہ اگر اس نے اقرار کر لیا تو نہ صرف یہ کہ انعام دیا جائے گا بلکہ آزاد بھی کر دیا جائے گا لیکن اگر انکار کرے گا تو پھر سخت سزا دی جائے گی۔ لیکن غلام نے صاف انکار کر دیا اور برابر انکار ہی کرتا رہا۔ زہری کو اس پر بہت غصہ آیا۔ اس کو نیچے ڈال کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور اپنی کہنی سے اس کے چہرے کو روندنے لگے لیکن اس نے اب بھی اقرار نہ کیا۔ زہری نے مجبور ہو کر چھوڑ دیا اور ارادہ کیا کہ اس کو معاف کر دیا جائے تاکہ کم از کم غلام تو اپنے قبضے میں رہے، کیونکہ مال سے انہیں مایوسی ہو چکی تھی۔

زہری اس کے سینے سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن حیران تھے، کہ غلام نہیں اٹھا، اس کو ہاتھ سے کھینچا۔ پاؤں سے ٹھوکر لگائی۔ سر کو حرکت دی، لیکن غلام نے حرکت تک نہ کی۔ اس کو جھک کر دیکھنے لگے۔ کانوں میں چیخ کر پکارا۔ سانس کی آمد و رفت معلوم کی، معلوم ہوا کہ نہ وہ سن رہا ہے، نہ سانس لے رہا ہے۔ غلام مر چکا تھا! زہری کا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا کہ غلام کو ہلاک کیا جائے۔ کیونکہ اس سے انہیں بہت آرام ملتا تھا۔ زدوکوب صرف مال کی وجہ سے کیا تھا وہ مال کا اقرار کر لے، لیکن ان کا دوہرا نقصان ہو چکا تھا۔ مال بھی گیا اور غلام بھی مر گیا۔ اس طرح زہری سے ایک زبردست غلطی اور بھاری جرم کا ارتکاب ہو گیا۔

زہری صالح و دین دار آدمی تھے، دل کو اضطراب و تردد ہوا۔ اس گناہ کی تلافی کے لئے سخت ادھیڑ بن میں مبتلا ہو گئے۔ بہت کچھ سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ غلام ان کی ملک تھا۔ اگر کوئی اور شخص ان کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا ہوتا تو یقیناً ان پر قتل خطا یا قتل شبہ عمد کی دیت لازم ہو جاتی لیکن چونکہ وہ ان کی ملک تھا اس لئے اس کی دیت کے بھی وہی شرعاً حق دار تھے۔ گویا زہری پر تلافی کا دروازہ بند تھا۔ نہ کوئی توبہ تھی اور نہ کفارہ!

زہری نے مدینہ کے فقہاء اور حفاظِ حدیث کی طرف رجوع کیا۔ وہ فوراً سعید بن المسیب کے پاس پہنچے اور واقعہ سنایا۔ سعید نے فرمایا (مجھے تمہارے لئے توبہ کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ اس کی دیت تم پر واجب نہیں وہ خود تمہاری ملک اور تمہارا غلام تھا۔ تم پر کوئی شرعاً مواخذہ نہیں) اس جواب سے زہری کو تسلی نہ ہوئی، وہ دوسرے فقہاء میں سے ایک ایک کے پاس پہنچے۔ ابوعبدالرحمٰن، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبداللہ بن عمر سب کو اپنی داستان سنائی مگر سب نے یکے بعد دیگرے یہی کہا، تمہارے لئے توبہ کی کوئی صورت ہمیں نظر نہیں آتی۔ ان حضرات نے بھی سعید بن المسیب کی طرح دیت کو ناواجب قرار دیا۔

زین العابدین ؒ کو یہ تمام قصہ، زہری کا استفتاء اور فقہاء کا جواب معلوم ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ زہری کے دل کو اس جواب سے شرح صدر اور تسلی نہیں ہوئی۔ فرمایا "زہری کو میرے پاس لاؤ"! زہری حاضر ہوئے اور تمام واقعہ سنایا۔ زین العابدین ؒ نے فرمایا "میرے خیال میں تمہارے اس جرم کی توبہ ایک صورت ہے تم کسی مسلمان غلام کو آزاد کر دو یا مسلسل دو مہینے کے روزے رکھو"۔

زین العابدین کے اس فیصلہ کے مطابق زہری نے عمل کیا۔ ان کی تمام کاوشیں اور قلبی پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ دیگر فقہاء نے یہ جواب سنا تو

سب نے تسلیم کیا اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔ زہری وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے "میں نے زین العابدین سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں دیکھا"۔

آزاد غلاموں کا میلہ

آنحضرت ﷺ کی طرف سے طائف والے دن، ایک منادی نے پکار کر کہا "جو غلام ہاتھ آئے گا وہ آزاد ہے اور اس کی ولاء اللہ اور رسول کے لئے وقف ہوگی"۔

بدری صحابی ابو مسعود اپنے ایک مملوک غلام کو کوڑے برسا رہے تھے۔ غلام فریاد کے لئے چیخ رہا تھا مگر کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ جس وقت وہ مار رہے تھے، پیچھے سے کسی کہنے والے کو سنا کہ کہتا ہے۔ "ابو مسعود! سنو!"

ابو مسعود نے آواز سنی، لیکن انہوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا یہ کس کی آواز ہے، کیونکہ غصہ نے گویا ان کے احساسات کو ختم کر دیا تھا۔ یہ آواز برابر قریب اور بلند ہوتی گئی، آواز تھی۔ "ابو مسعود، سنو!"

ابو مسعود نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اس وقت وہ آواز ان سے بالکل قریب آچکی تھی۔ ابو مسعود دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے اور خوف و ہیبت سے لرز اٹھے۔ کوڑا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ رسول اللہ ﷺ تھے، فرما رہے تھے "ابو مسعود، سنو! ابو مسعود! سنو!" ابو مسعود نے جب سر جھکا لیا اور رعب و جلال سے سراسیمہ کھڑے رہ گئے تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "ابو مسعود یاد رکھو! اس غلام پر تمہارا جس قدر بس چلتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا اس سے بھی زیادہ تم پر بس چلتا ہے۔" ابو مسعود شرم سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اپنے اس گناہ کا کفارہ دینا چاہا توبہ کی اور عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ غلام اللہ کے لئے آزاد ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو یقیناً جہنم کی آگ تم کو جھلس کر رکھ دیتی"۔

جنگی فتوحات کے نتیجہ میں اموالِ غنیمت کے ساتھ سینکڑوں بلکہ ہزاروں غلام اور کنیزیں مدینہ میں لائی جا رہی تھیں، گویا غلاموں کی فوج زمین سے ابل رہی تھی۔ کوئی اطلاع یا ڈاک نہ تھی جو جنگی محاذ سے روانہ ہو رہی ہو اور اس کے ساتھ قیدی غلاموں کو نہ بھیجا جا رہا ہو۔ یہی غلام اور کنیزیں بالآخر مہاجرین و انصار اور ان کی اولاد میں اموالِ غنیمت کے ساتھ بطور تحفہ مستحقین میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ مدینہ ایک بازار میں تبدیل ہو گیا تھا، جس میں تحفہ دینے یا تجارت کے لئے ان غلاموں کا ہجوم رہتا تھا۔ زین العابدین ؑ غلاموں کو دیکھتے، انہوں نے کثرت سے غلام خریدے، ان سے وہ اپنے کاموں میں خدمت لیتے۔ ان پر انعام و عطا کی بارش کرتے، حتیٰ کہ جب آزادی دینے کا وقت آتا تو ان کو آزاد کر دیتے۔ ان کی آزادی کا وقت ان کے لئے قریب ہی رہتا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزرتی کہ غلام ان کے گھر میں خریدا ہوا ہونے کی حیثیت سے داخل ہوتا اور دوہری دولتوں سے مالا مال ہو کر گھر سے نکلتا۔ ایک دولت آزادی اور دوسری دولت اسلام۔

زین العابدین ؑ نے غلاموں کی اس خرید پر بے شمار مال خرچ کیا۔ ان کی آمدنی بڑی زبردست تھی۔ وہ اپنے والدین کے ترکہ میں زمین کے وارث ہوئے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملتا تھا۔ زمین میں کاشت کراتے تھے اور زمینوں کے چشموں سے پانی کے ذریعہ آمدنی میں اضافہ کرتے۔ علاوہ ازیں تجارت پر بہت سے کارندے ملازم تھے، جو حجاز و نجد کی پیداوار اونٹوں کے ذریعہ شام میں لے جا کر فروخت کرتے اور شام کے غلے اور پھلوں سے اونٹوں کو بھر کر حجاز میں لا کر فروخت کرتے تھے۔

زین العابدین ؑ کا معمول تھا کہ وہ غلاموں اور مسکینوں کو کھانے کھلاتے۔ صدقہ و خیرات کرتے، رحم و عفو سے کام لیتے، چند ہی دنوں غلاموں کے مالک رہتے اور بالآخر انہیں آزاد کر دیتے، یہ وہ فضیلت تھی کہ ان کا مقابلہ کرنے کی کسی میں یہ طاقت نہ تھی۔ عام عادت یہ تھی کہ کنیزوں اور غلاموں کی لغزشوں کو معاف کرنے اور بالآخر آزاد کر دینے کا باعث ٹھہرایا جائے، ان کے علاوہ کون ایسا کرنے پر تیار ہو سکتا تھا کہ غلام یا کنیز کی لغزش اور بیہودگی کو اس کی آزادی اور اس پر احسان کرنے کا ذریعہ قرار دیا جائے۔

ان خدمتگار غلاموں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ایک سال سے زائد ان کی خدمت میں مشغول رہا اور پھر زین العابدین ؑ نے اس کو اس کی آزادی اور ولاء دونوں چیزیں نہ بخش دی ہوں۔ اس کام کے لئے ان کے ہاں ایک باقاعدہ رجسٹر تھا جس میں غلاموں کی لغزشوں کا اندراج اور شمار ہوتا تھا اور جب رمضان کی آخری رات یعنی شب عید الفطر آتی تو ان تمام کو طلب فرماتے وہ رجسٹر کھولتے اور ایک ایک کر کے ان کی غلطیوں کو شمار کراتے، اس کے بعد ان سے فرماتے کہ وہ اپنی ان غلطیوں کا اعتراف کرو، جب وہ اعتراف کرتے تو فرماتے کہ قبلہ رو ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کرو "اے اللہ! علی بن حسین ؑ کے گناہوں کو معاف کر" جب وہ سب یہ دعا مانگ چکتے تو ان کو پروانہ آزادی بخشتے، اس کے علاوہ ان کو عید کے لئے اور زندگی گزارنے کے لئے جس قدر ضرورت ہوتی وہ بھی بخشتے۔

دیگر غلاموں کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ کوشش کرنے لگے کہ اپنے مالکوں کے ہاتھوں سے نجات پا کر کسی طرح زین العابدینؒ کی ملک میں چلے جائیں، غرض زمانہ یوں ہی کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح و شام گزرتے رہے اور زین العابدینؒ ہر سال، ہر ماہ اور ہر روز غلاموں کی لغزشوں اور خطاؤں پر حریت کو عام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مدینہ میں آزاد شدہ غلاموں اور کنیزوں کی ایک زبردست فوج ہو گئی۔ یہ تمام زین العابدینؒ کے آزاد کردہ تھے۔ جن کی تعداد پچاس ہزار سے بھی متجاوز تھی۔

علی بن حسینؒ، مشرق و مغرب میں لوگوں کی گفتگو اور تذکروں میں ایک بہترین موضوع کی حیثیت سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کے اس شہرہ کو کوئی دیوار نہ روک سکتی تھی اور نہ کوئی فوج وہ تمام اسلامی بلاد میں ایک مثالی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے مسلمانوں کے تمام گھران کی خوبیوں کے ترانے گا رہے تھے۔ ہر صاحب دل کی یہ خواہش تھی کہ ان کو اپنی موت سے پہلے کم از کم ایک بار ضرور جی بھر کر دیکھ لے۔ ایام حج میں وہ عام لوگوں کے میزبان ہوتے۔ لوگ ان کے دسترخوانوں پر رنگ رنگ کے کھانوں کے علاوہ ان کی زیارت کے بھی مشتاق ہوتے اور جب زیارت کرتے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ وہ ان کے قصوں اور باتوں سے اپنے دل و دماغ بھر لیتے اور پھر شوق و وجد کے ساتھ اپنے گھر والوں کو جا کر سناتے۔

یہ حال اہل بیت، اہل مدینہ، غلاموں اور کنیزوں سب ہی کا تھا۔ ایام حج کی راتوں میں وہ یہ باتیں غور سے سنتے اور پھر سب کو سناتے، کوئی اپنی جماعت میں سناتا اور کوئی اس منزل کے مسافروں کو جہاں وہ نزول و قیام کرتا تھا۔ اس طرح یہ اوصاف حمیدہ تمام دنیائے اسلام میں پھیل چکے تھے۔ ہر ایک داستان گو کے واقعات میں جدتوں کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔

حسن بن حسنؒ فرماتے ہیں، میرے اور زین العابدینؒ کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف ہوا۔ میں ان کے پاس گیا وہ اس وقت مسجد نبوی میں کچھ لوگوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے میں نے غصہ میں باتیں کرنا شروع کیں تو کہنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، زین العابدین خاموش بیٹھے سنتے رہے، میں واپس چلا آیا۔ رات کے وقت کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا، میں اٹھ کر دروازے پر پہنچا تو دیکھا، زین العابدینؒ کھڑے ہیں۔ ان کے اس وقت اچانک پہنچنے پر میں نے دل میں قطعی طور پر یہ رائے قائم کی کہ وہ مجھے سخت سست کہنے اور دن کی گفتگو کے جواب میں میری تردید کرنے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے فرمایا۔ بھائی! جو کچھ تم نے کہا اگر واقعی تم اس میں سچے ہو؟ تو خدا میرے گناہ معاف فرمائے۔ اگر تم سچے نہیں ہو تو خدا تمہارے گناہ بخشے!'' اس کے بعد سلام کیا اور واپس چلے گئے۔

مجھے ان کے چلے جانے پر افسوس ہوا، بلکہ یہ افسوس میرے افکار و شعور پر چھا گیا۔ میں فوراً ان کے پیچھے پیچھے دوڑا اور پیچھے سے ان کے کپڑے پکڑ کر کھینچتے ہوئے رو کر کہا، ان کا دل بھی میری اس حالت پر ابھر آیا تھا، وہ ٹھہر گئے۔ میں نے عرض کیا'' بھائی جو کچھ ناگوار باتیں میں نے کیں وہ مجھ سے غصہ میں نکل گئی تھیں!'' فرمایا تم نے جو کچھ کہا، وہ میں تمہارے لئے حلال قرار دیتا ہوں''

اہل مدینہ میں سے ایک شخص راوی ہے کہ'' ایک مرتبہ زین العابدینؒ سے میری ملاقات مسجد نبوی سے باہر ہوئی۔ میں گفتگو میں اس قدر بہکا کہ ان کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ میں نے ان کو کافی برا بھلا کہا۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ غرض میری اس گستاخی پر غلام اور موالی مجھے پکڑ لینے کے لئے آگے بڑھے، حقیقت یہ ہے اگر وہ مجھے چمٹ جاتے تو میری تکا بوٹی کر دیتے، لیکن علی بن حسینؒ نے ان کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا'' خبردار جو اس شخص کو ہاتھ لگایا'' وہ یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے۔

میں اس صورت حال سے گھبرا گیا، ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ خاموش کھڑا رہ گیا۔ زین العابدینؒ اور ان کے غلام آگے بڑھے، پھر زین العابدین مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر بولے'' گھبراؤ نہیں، دل مضبوط کرو۔''

پھر فرمایا تم نے ہمیں جو کچھ کہا وہ اسی قدر ہے جو تمہیں معلوم ہے لیکن ہمارے اندرونی حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں'' پھر مجھ سے فرمایا'' تمہیں کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ، ہم تمہاری مدد کریں گے'' مجھے ان کی اس بات پر سخت شرم آئی۔ انہوں نے مجھے شرماتے دیکھ کر اپنی سیاہ دھاری دار چادر اتاری اور مجھے اوڑھا دی اور حکم دیا کہ اسے ایک ہزار درہم پہنچا دیئے جائیں۔ اس کے بعد میری یہ حالت تھی کہ جب بھی ان کو دیکھتا تو کہتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ رسول اللہﷺ کی اولاد میں سے ہیں''

ایک مرتبہ آزاد غلاموں میں ماضی کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا تو ایک نے کہا'' میں علی بن حسینؒ کا غلام تھا، انہوں نے مجھے ایک کوڑا مارا، قصہ یہ ہوا کہ مجھے کسی کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ میں نے وہاں دیر کر دی اور جب پہنچا تو یہ سزا ملی، میں رونے لگا۔ دل بھر آیا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کسی کو نہیں مارتے۔ میں نے کبھی ان کو کسی کو سزا دیتے نہ دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اس اونٹنی کو بھی نہ مارتے تھے جس پر وہ حج کرتے تھے۔ اگر کبھی وہ اونٹنی شرارت کرنے لگتی تو اس سے اتر جاتے۔ اس کو کوڑے سے ڈراتے اور پھر آرام سے گھومنے دیتے۔ کچھ دیر بعد

اس کے پاس آتے اور سوار ہو جاتے، غرض جب مجھے غصہ آیا تو میں نے کہا، علی بن حسین ؑ خدا سے ڈرو، تم مجھے اپنے کام کے لئے بھیجتے ہو اور پھر مارتے ہو! یہ الفاظ سن کر میرے آقا رو پڑے اور مجھ سے فرمایا۔ ''جاؤ رسول اللہ ﷺ کے روضہ کے قریب جا کر دو رکعت پڑھو اور دعا کرو کہ الٰہی! علی بن حسین ؑ کی مغفرت فرما، اگر تم گئے اور ایسا ہی کیا تو تمہیں اللہ کے لئے آزاد کرتا ہوں'' میں گیا، دو گانہ ادا کیا اور دعا مانگی، واپس لوٹا تو میں آزاد تھا''۔

دوسرے غلام نے اپنا واقعہ سنایا ''میں اس واقعہ کی نسبت زیادہ سنگین جرم میں پھنسا اور آزاد ہوا، میں ان کا غلام تھا اور ان کی ایک زمین پر نگران تھا۔ وہ ایک روز میرے پاس تشریف لائے، زمین میں نہایت بدنظمی، پراگندہ حالی اور تباہی دیکھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام صورت میری غفلت سے ہوئی تھی۔ میری اس کوتاہی کو دیکھ کر زین العابدین ؑ بہت ناراض ہوئے، ان کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ مجھے اس سے مارا اور مجھے وہیں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔

گھر پہنچے تو مجھے بلایا، میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ چہرے پر سخت ناراضی کے اثرات ہیں اور ہاتھ میں کوڑا لیے بیٹھے ہیں۔ میں کانپ گیا اور بہت ڈرا، کیونکہ مجھ سے واقعی ایسا قصور ہوا تھا کہ جس کی سزا مجھے پوری نہ ملی تھی، لیکن انہوں نے مجھ سے فرمایا ''مجھ سے آج جیسی غلطی پہلے کبھی نہ ہوئی، میں نے تمہیں مارا، یہ میری بہت بڑی لغزش تھی، یہ کوڑا لو اور مجھ سے اپنا بدلہ لے لو'' میں نے عرض کیا ''میرے آقا! خدا کی قسم، میں تو یہ خیال کر کے آیا تھا کہ مجھے میری کوتاہی پر آپ مزید سزا دیں گے اور یہ واقعہ ہے کہ میں اس کا مستحق بھی ہوں، لہٰذا میں آپ سے بدلہ کیا لوں؟ مجھے تو میری غلطی کی سزا ہی نہیں ملی''۔

زین العابدین ؑ نے فرمایا، کمبخت، بدلہ لے لو'' میں نے عرض کی، خدا کی پناہ، آپ تو بہت وسعت قلبی سے کام لے رہے ہیں۔ غرض زین العابدین ؑ بار بار مجھے بدلہ لینے کا حکم فرما رہے تھے اور میں ان کے اس فقرے کو انتہائی حیرانی سے سن رہا تھا اور ان کی اس تواضع کی عظمت سے زمین سے لگا جا رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں ان کے ارشاد کی تعمیل نہیں کرتا تو فرمایا ''اچھا اگر تمہیں انکار ہے تو تم آزاد ہو، اور وہ زمین بھی تم کو دیتا ہوں''۔ یہ ہے میری آزادی اور دولت مندی کی کہانی!''

ایک غلام نے اپنی داستان اس طرح شروع کی ''تم دونوں کے واقعات معمولی نوعیت کے ہیں! میرا جرم اور کوتاہی اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی، میں زین العابدین ؑ کا غلام تھا اور تنور پر کھڑا ہوا مہمانوں کے لئے گوشت بھون رہا تھا۔ زین العابدین تشریف لائے اور جلدی کھانا تیار کرنے کو فرمایا۔ میں نے تنور میں سے بھنے ہوئے گوشت کی سلاخیں نکالیں، وہ آگ کی طرح بالکل سرخ تھیں، میں جلدی سے یہ سلاخیں لے کر چلا۔ اتفاق سے ان میں سے ایک سلاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے آقا کے بچہ کے سر پر گری، یہ سلاخ اس کے سر پر اس زور سے لگی کہ اس کا اس ضرب سے انتقال ہو گیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا اور چلے گئے، زین العابدین ؑ نے مجھے پکارا، میں دیوانہ وار، ڈرتا، کانپتا، زرد رو، حاضر خدمت ہوا۔ میں اپنے سر پر کفن باندھ کر گیا۔ انہوں نے میری یہ حالت دیکھی تو دیکھتے ہی معافی کی خوشخبری دی، میں ابھی معذرت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہہ پایا تھا کہ فرمایا تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ تم آزاد ہو۔ پھر فرمایا ''بچہ کی تکفین و تدفین کا انتظام کرو''۔

اس کے بعد ایک کنیز نے اپنا ماجرا سنایا، اس نے کہا، میں زین العابدین ؑ کی کنیز تھی ایک دن زین العابدین ؑ کو وضو کرا رہی تھی۔ ہاتھ میں لوٹا تھا اور پانی ڈال رہی تھی، اچانک میرے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ کر گر پڑا۔ پانی کے چھینٹے زین العابدین ؑ کے چہرہ پر گرے۔ انہوں نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور کچھ نہ فرمایا۔ میں بہت ڈری۔ مگر مغا سنبھل گئی۔ کیوں کہ ان کے عفو و اخلاق کی عادت سے واقف تھی۔ میں نے عرض کی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''متقی لوگ اپنے غصہ کو قابو میں رکھتے ہیں''۔

زین العابدین ؑ: میں غصہ کو قابو میں رکھوں گا۔

کنیز: اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ''وہ لوگوں کی غلطی کو معاف کرتے ہیں''۔

زین العابدین: اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے۔

کنیز: اور یہ بھی ارشاد ہے ''اللہ محسنوں کو دوست رکھتا ہے''۔

زین العابدین: ''جاؤ تم آزاد ہو''۔

مدینہ میں خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں کہ یزید بن معاویہ کی تمام زندگی لہو و لعب اور فرائض حکومت سے سہل انگاری میں گزر رہی ہے۔

دوسری طرف لوگوں نے کربلا کے روح فرسا اور جانکاہ ہولناک واقعہ کو بھی فراموش نہ کیا تھا۔ یزید کی حکومت کا یہ تاریک ترین واقعہ تھا جس پر وہ ایک خوشنما اور آراستہ مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مدینہ کے عام باشندوں کا طرز و سلوک یزیدی حکومت کے ساتھ موافقانہ نہیں معاندانہ تھا، کتاب وسنت کی تابناک کرنیں ان کے موقف کی تائید کرتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں آگ تھی جو یزید کے برخلاف مشتعل تھی۔ چنانچہ یزید کے برخلاف تحریک اٹھی۔ اس کے مقررہ عامل کو اور خاندان بنوامیہ کے لوگوں کو خارج کر دیا گیا۔ بیعت یزید فسخ کر دی گئی۔ یزید نے مدینہ والوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے مسرف بن عقبہ کو روانہ کیا۔

مسرف بن عقبہ ان ہی دنوں یزید کے پاس فلسطین سے پہنچا تھا۔ وہ ضعیف، بیمار اور بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی تریسٹھ سال عمر ہو چکی تھی۔ یزید نے اس کو اپنے گھر پر طلب کر کے بڑے بڑے وعدوں کے بعد اس پر آمادہ کیا کہ مختلف اطراف سے عرب و عجم کی مخلوط بارہ ہزار فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دے۔ فوجی جھنڈوں پر روح بن زنباع جنبش بن دلجہ، عبداللہ بن مسعدہ، حصین بن نمیر اور زفر بن حارث کو مقرر کیا اور فوجیوں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا۔ چنانچہ اس نے چلنے سے پہلے سو، سو دینار ہر شخص کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

مسرف نے اہل مدینہ سے خونریز جنگ لڑی۔ یہ لڑائی باب طیبہ کے قریب مدینہ کے بالائی حصوں میں سے ایک مقام حرہ واقم پر ہوئی۔ دونوں طرف سے زبردست تصادم ہوا۔ عرصہ تک بغیر کسی ہار جیت کے لڑائی جاری رہی حتیٰ کہ مسرف کامیاب ہو گیا۔ فتح کے بعد شہریوں کا بے دریغ خون بہایا گیا اور فوجیوں کو تین روز تک آزادانہ لوٹ مار کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

مدینہ کی اس مدافعت میں آزاد شدہ غلاموں نے اپنی جانوں پر کھیل کر لڑائی لڑی۔ سب سے زیادہ یہی لوگ تیروں کا نشانہ بنے۔ چنانچہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کی لاشیں گنی گئیں تو وہ تین یا چار ہزار تھیں۔ قریش وانصار میں سے تین سو سے زیادہ کام آئے۔ لوگوں کے اموال لوٹ لیے گئے۔ بچوں کو قید کیا گیا اور پردہ نشیں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔

مسرف نے لوگوں کو اس شرط پر بیعت لینے پر مجبور کیا کہ وہ یزید کے غلام بن جانے پر راضی ہوں۔ اس کے بعد وہ چاہے تو ان کو آزاد کر دے اور چاہے تو فروخت کر دے۔ چنانچہ قریش کے لوگوں کو لایا جاتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا، اس شرط پر بیعت کرو کہ تم غلام ہو۔ اگر وہ اس کے جواب میں کہتے نہیں! تو ان کی گردن اڑا دی جاتی یہ سلسلہ چلا حتیٰ کہ مسرف نے زین العابدین کو بھی طلب کیا۔ وہ روضہ نبوی میں پناہ گیر تھے۔ مسرف کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے دائیں بائیں مروان اور اس کا لڑکا عبدالملک بھی ہمراہ تھے۔ جو مسرف سے ان کے لئے امان کی درخواست کر رہے تھے۔ مسرف کے سامنے جب آپ کو لایا گیا، تو وہ کہنے لگا۔ علی بن حسینؓ کا معاملہ اگر صرف تمہاری امن طلبی تک محدود ہوتا تو خدا کی قسم میں تمہاری بات ہرگز نہ سنتا اور ان کو ضرور قتل کر دیتا۔ لیکن امیر المومنین یزید نے مجھے خود ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کو زندہ رہنے دیا جائے۔

مسرف نے زین العابدینؓ سے کہا، ''میرے ہاتھ پر بیعت کرو'' فرمایا، ''یزید مجھ سے کس چیز پر بیعت لینا چاہتا ہے؟'' زین العابدینؓ کا تخاطب کچھ ایسے انداز میں تھا، کہ مسرف پر ان کی ہیبت طاری ہو گئی، کہنے لگا ''بیعت اس شرط پر کہ آپ ان کے بھائی اور چچا کے صاحبزادے کی حیثیت سے رہیں گے'' اس کے بعد اس نے زین العابدین کو اپنے برابر جگہ دی اور کہا ''اگر کچھ ضرورت ہو تو فرمایئے'' زین العابدینؓ نے صرف ایک درخواست کی، کہ عام پبلک سے تلوار کھینچ لی جائے!

اس کے بعد علیؓ اٹھ آئے اور مسرف بھی واپس چلا گیا۔ علیؓ سے کہا گیا، ''آپ جس وقت مسرف کے پاس لے جائے جا رہے تھے، ہم نے دیکھا کہ آپ کے ہونٹ پھڑک رہے تھے، آپ کیا فرما رہے تھے؟'' جواب دیا ''میں اس کے شر سے اللہ سے پناہ مانگ رہا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ خدا اس کو دفع کر دے!''

مسرف سے اس کے درباریوں نے پوچھا ''علیؓ جب تک آپ کے پاس نہیں پہنچے تھے، آپ ان کو اور ان کے گھر والوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ لیکن جب وہ سامنے آئے تو آپ نے ان کا اکرام کیا۔'' کہا ''میرا دل ان کے رعب و جلال سے کچھ اس طرح دہشت زدہ ہوا کہ میں اپنے اختیار میں نہ رہا۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مروان اور اس کے لڑکے عبدالملک نے زین العابدینؓ کے لئے امان کی درخواست کی تھی۔ یہ اصل میں اس عنایت ومہربانی کا جواب تھا جو کچھ دن پیشتر زین العابدینؓ نے بنوامیہ پر کی تھی۔ اہل مدینہ نے بنی امیہ پر چڑھائی کی، تو مروان نے پہلے پہل ابن عمرؓ سے حمایت کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ مروان زین العابدینؓ سے امان کا طالب ہوا۔ زین العابدینؓ نے تمام بنی امیہ کے جان و مال کو امان دی۔ یہ تاریخ کا عجیب موڑ تھا کہ زین العابدینؓ نے اپنے کٹر دشمن کی حمایت کی، اور نہایت امن

وآرام سے ان کو مقام ینبع میں پہنچا دیا۔

مدینہ میں جب اس فتنہ کی گھٹا چھائی تو تمام مدینہ کی عورتوں نے علی ؑ کے گھر میں پناہ لی۔ یکے بعد دیگرے عورتوں کی ٹولیاں ان کے مکان کا رخ کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبوتروں کا ہجوم ہے جو باز سے پناہ لے رہا ہے۔ رات کی خاموشی میں جبکہ تیروں کی بارش بند ہو جاتی تو عورتوں اور بچوں کی فوج گراں اس گھر میں داخل ہوتی۔ ان پناہ گیر عورتوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی ان میں اکثر عبد مناف سے تھیں، جو کبھی بھی ان کے گھر میں کنیز کی حیثیت سے نہ رہی تھیں۔ البتہ قلیل تعداد میں ان کے علاوہ بھی کچھ مختلف عورتیں تھیں۔ زین العابدین نے نہ صرف ان کو بے خوف اور محفوظ رکھنے کی کوشش کی بلکہ ان کی اس حادثہ کے فرو ہونے تک کھانے اور کپڑے سے بھی مدد دی۔ غرض فتنہ فرو ہو جانے پر ہر عورت واپس ہو گئی۔

زین العابدین ؑ کی خدمت میں اہل مدینہ اپنی مصیبتوں کی فریاد لے کر آتے تو وہ روتے۔ کیونکہ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ البتہ وہ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کر کہہ رہے تھے۔

''اے پروردگار، تو بڑا حلیم ہے۔ تیری شان اور تیری قدرت بہت عظیم ہے!

''اے پروردگار، اپنی سرزمین پر تو نے اپنے بندوں کو ٹھکانا دیا، وہ یہ یقین رکھتے ہیں، کہ تو ان کو اس سے محروم نہیں کرے گا!

''اے پروردگار، یہ سب کچھ تو دیکھ رہا ہے، تیرے فیصلے اٹل ہیں، تیری تدبیروں کو کوئی رد نہیں کر سکتا، تو ہم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔''

وقت نے بہت تیزی سے کروٹ بدلی، ملک کی خلافت عبدالملک بن مروان کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی۔ عبدالملک نے اہل مدینہ سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ موقع کی تاک میں تھا کہ کوئی گرفت کا موقعہ ہاتھ آئے، گو وہ سب سے زیادہ زین العابدین ؑ سے ڈرتا تھا مگر فرصت و موقع کی تاک میں رہتا کہ کسی طرح ان ہی سے اپنے شر کی ابتدا کرے۔

عبدالملک کو معلوم ہوا کہ زین العابدین ؑ نے اپنی کنیز کا کسی سے نکاح کر دیا ہے جس نے ان کو پرورش کیا تھا اور جس کو عرصہ تک وہ اپنی ماں تصور کرتے رہے تھے، اس کے بعد معلوم ہو کہ خود زین العابدین ؑ نے ایک باندی جوان کے تایا حضرت حسن ؑ کے ترکہ میں ان کو ملی تھی۔ اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ عبدالملک نے اپنے اعتراض کی گرفت میں لینے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور زین العابدین ؑ کو لکھا،

''معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنی باندی سے نکاح کیا ہے کیا تمہارے خاندان (قریش) میں کوئی لڑکی اس قابل نہ تھی جس کو تم اپنے نکاح میں لاتے اور ہونے والی اولاد کو بھی خاندانی عزت بخشتے، تم نے خود پر نظر کی اور نہ ہونے والی اولاد کو کہیں کا چھوڑا۔''

علی بن حسین ؑ نے خط پڑھ کر عبدالملک کو جواب میں لکھا۔

''حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ تمہارا خط ملا، تم نے مجھے اپنی باندی سے نکاح کر لینے پر برا بھلا کہا ہے، تمہارا خیال ہے، مجھے شادی کے لئے قریش میں سے کوئی لڑکی انتخاب کرنی چاہئے تھی۔ تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کو خاندانی عزت نصیب ہوتی، یاد رکھو! رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر عزت و شرف میں کوئی شخص نہیں ہو سکتا، باندی میری ملک تھی، جس کو میں نے خدا کی خوشنودی و ثواب حاصل کرنے کے لیے اپنی ملک سے آزاد کیا اور اسی کے حکم کے مطابق میں نے اس سے نکاح کیا۔ خدا کے دین میں انسان کے شرف کے لئے یہ باتیں قطعاً خلل انداز نہیں۔ اللہ نے خاندانی پستی کو ختم کرتے ہوئے تنقیص و ملامت کی تمام شکلوں کو غلط قرار دیا ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کو ملامت نہیں کرنی چاہئے، ملامت کے قابل جاہلیت کے پرانے دستور ہیں، والسلام''۔

عبدالملک نے یہ خط پڑھا، پڑھ کر اپنے لڑکے سلیمان کی طرف پھینک دیا۔ سلیمان نے پڑھ کر کہا۔ ''امیر المومنین علی بن حسین ؑ نے آپ کے مقابلہ میں جو فخر کا اظہار کیا ہے، اس کا بڑا ہی ناگوار انداز ہے!''

عبدالملک نے کہا، ''بیٹا یہ نہ کہو علی بن حسین ؑ، بنی ہاشم کے خاندان میں بڑے زبان آور ہیں، لوگ جس مقام پر ذلیل ہوتے ہیں علی بن حسین اسی مقام پر سربلند ہوتے ہیں۔''

پھر عبدالملک نے درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ''مجھے کوئی ایسا شخص بتاؤ کہ وہ اس سطح پر ہونے کے باوجود کہ جس پر معمولی انسان ہوتے ہیں پھر بھی لوگوں میں شرف و عزت کے اعتبار سے ترقی کر رہا ہو؟''

درباریوں نے عرض کیا: ''حضور وہ تو آپ ہی ہیں۔''

عبدالملک نے کہا: ''ہرگز نہیں''!

درباریوں نے عرض کیا: ''امیر المومنین کے سوا ہمیں ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔''

عبدالملک نے کہا ''ہرگز نہیں، امیر المومنین نہیں، بلکہ وہ علی بن حسین ؒ ہیں۔''

بھولی بسری یادیں:

امیر معاویہ ؓ نے مدینہ کی امارت سے زید بن ثابت ؓ کو معزول کرتے ہوئے عبدالملک بن مروان کو مقرر کیا۔ عبدالملک کی عمر اس وقت صرف سولہ سال تھی۔ اس زمانہ میں عبدالملک کی مسجد نبوی میں آمد و رفت بکثرت تھی۔ گو وہ نوعمر لڑکا تھا۔ لیکن مسجد نبوی میں حاضری کا بڑا شائق تھا۔ وہ صحابہ و تابعین کی علمی مجلسوں میں بیٹھ کر مستفید ہوتا۔ واقعہ حرہ کے موقعہ پر جب مسرف بن عقبہ نے اپنے لشکر سمیت مدینہ پر دھاوا بولا تو اس کی فوج میں سے ایک شخص ''یحییٰ غسانی'' عبدالملک کے پاس مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ عبدالملک نے اس کو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے قاتلانہ وحشت و خون برس رہا ہے۔ اس سے پوچھا: ''تم اسی فوج سے تعلق رکھتے ہو؟'' جواب دیا ''جی ہاں'' عبدالملک کہنے لگا، ''خدا غارت کرے۔ آخر تم لوگ اس پر حملہ آور ہونا چاہتے ہو''؟

عبدالملک خلافت کا متمنی تھا، وہ ایک ایسی خلافت کا علم بردار بننا چاہتا تھا جس میں عام رعایا سے عدل و انصاف کا سلوک اور دوستوں سے مروت و پاسداری برتی جائے، چنانچہ کسی موقعہ پر خانہ کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے اس نے ''عمارۃ الفقیر'' سے کہا تھا: ''عمارہ! اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ لوگوں کی گردنیں میرے سامنے جھکی ہوئی ہوں گی اور ان کی آرزوؤں کی تکمیل ہو رہی ہو گی'' لیکن خلافت اس کے ہاتھ آئی تو اس کے الفاظ کا تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ اس میں یکسر تبدیلی ہو گئی۔ اہل مدینہ پر سنگ دلی کا وہی مظاہرہ کیا گیا جو اس کے پیش رؤں نے روا رکھا تھا۔ جنگ آزمائی اور لوگوں کو کچل ڈالنے کے لئے اس نے بھی لشکر حجاز کی طرف روانہ کیے۔ اس لشکر میں وہی ''یحییٰ غسانی'' اسی عبدالملک کے حکم سے حجازیوں کے خلاف جنگ کرنے اور اس کو زبردستی تابع فرمان بنانے کے لئے چڑھائی کر رہا تھا۔ وہ عبدالملک پر نوحہ پڑھ رہا تھا اور حیرانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

عبدالملک نے ۷۵ھ میں حج کیا۔ پہلے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نہایت گرجدار، فتنہ انگیز اور ناقابل برداشت تقریر کی، اور حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ طواف میں مشغول تھا کہ زین العابدین ؒ کو بھی طواف کرتے ہوئے دیکھا ارادتاً خود کو نمایاں کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرا، تاکہ وہ دیکھیں، لیکن زین العابدین نے اس کی طرف التفات نہیں کیا۔ وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ طواف کرنے میں مشغول رہے۔ اس طور طریق کا عبدالملک پر بڑا اثر ہوا۔ عبدالملک کا خیال تھا کہ زین العابدین ؒ طواف سے فارغ ہو کر اس کی خدمت میں آ کر ملیں گے۔ لیکن زین العابدین ؒ تشریف نہ لائے تو اس نے حکم دیا کہ زین العابدین ؒ کو ہماری خدمت میں حاضر کرو۔ وہ تشریف لائے تو کہنے لگا، ''تمہارے والد کو میں نے قتل نہیں کیا، کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے نہیں ملتے؟''

زین العابدین ؒ نے فرمایا ''میرے باپ کے قاتل نے ہماری دنیا برباد کی اور میرے باپ نے اپنی مظلومانہ شہادت سے اس کی آخرت کو تباہ کیا۔ اگر تم بھی یہی پسند کرتے ہو تو شوق سے کر گزرو۔''

عبدالملک کہنے لگا نہیں نہیں، مطلب یہ ہے کہ تم کو ہم سے وابستہ رہنا چاہئے۔ تمہیں کوئی ضرورت ہو تو اظہار کرو۔ ہم پوری کریں گے۔''

فرمایا ''بیت اللہ میں اللہ کے سوا کسی سے سوال نہیں کیا جا سکتا!''

عبدالملک اس خودداری کے جواب پر غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا، لیکن زین العابدین ؒ نے کوئی پرواہ نہ کی، خانہ کعبہ کے پردوں سے چمٹ چمٹ کر دعا مانگنے لگے،

''یا الٰہی! دنیوی بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر کے ان پر چوبدار اور محافظ مقرر کر دیئے۔ لیکن تیرا دروازہ تمام سائلین کے لئے کھلا ہے۔ میں بھی حاضر ہوا ہوں تاکہ تیری نظر التفات حاصل کروں۔''

عبدالملک نے ابان بن عثمان بن عفان کو مدینہ سے معزول کرتے ہوئے ان کی جگہ ہشام بن اسماعیل مخزومی کو مقرر کیا۔ وجہ یہ تھی کہ ابان بزل و تمسخر کے عادی اور مذاقی آدمی تھے ان کے مقابلہ میں ہشام مخزومی خشک اخلاق اور درشت مزاج تھا۔ ہشام نے مدینہ پہنچ کر اہل مدینہ اور وہاں کے فقہا و گوشہ نشین عبادت گزاروں کو سخت اذیتیں دیں۔ خصوصاً زین العابدین اور ان کے اہل بیت کو مسجد نبوی میں برملا اپنی دشنام طرازیوں اور گوناگوں ایذا رسانیوں کا نشانہ بنایا۔ زین العابدین اس ناروا سلوک کے جواب میں قطعاً خاموش تھے۔ اہل بیت میں سے اگر کوئی

ہشام کو اس بدتمیزی سے منع کرنا چاہتا تو زین العابدینؒ اس کو منع کر دیتے۔ فرماتے،

''مخزومی کو جو کچھ وہ چاہتا ہے کر لینے دو۔ اس کی معزولی یا تباہی کے دن قریب ہی ہیں۔''

زین العابدینؒ کی اس تشویش کو دور کرنے اور دل کو صبر و قرار بخشنے والی صرف نماز یا دعا تھی۔ اس سے بھی زیادہ ان کے قلب کو صبر و ثبات ہر سال حج میں نصیب ہوتا۔ ایک عمدہ اور تیار اونٹنی پر حج کو روانہ ہوتے۔ اس کو اپنی رفتار میں آزاد چھوڑ دیتے اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ دوڑتی رہتی۔ نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ اس کو مشقت میں ڈالنا اور جھڑکنا تک بھی گوارا نہ تھا، اگر اس کی چال میں تھکان یا گھبراہٹ محسوس کرتے تو کوڑا اس کی نگاہوں سے چھپا دیتے اور یہ حالت دور ہونے تک نیچے اتر کر پیادہ سفر کرتے۔ احرام باندھ کر مواقع حج میں داخل ہو جانے کے بعد زین العابدینؒ پر خوف الٰہی کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ آواز میں تضرع اور خشیت ہوتی۔ مسجد الحرام میں پہنچنے کے بعد میزاب رحمت کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ حرم کی جانب متوجہ ہو کر رو رو کر دعائیں مانگنے لگتے۔ دیکھنے والوں کے بھی دل بھر آتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

ایک مرتبہ ایسی ہی حالت میں ان کو مشہور محدث و عابد طاؤس نے دیکھا۔ زین العابدینؒ جس وقت اپنی دعا اور گریہ و زاری سے فارغ ہوئے تو طاؤس نے آگے بڑھ کر عرض کی۔

''اے صاحبزادۂ رسول! میں نے تمہیں ایسی حالت میں دیکھا کہ میں تم میں تین وصف قابل رشک پاتا ہوں۔ امید ہے کہ ان کی بدولت آپ کو آخرت میں کوئی خطرہ نہیں پیش آئے گا''۔

زین العابدین: وہ وصف کیا ہیں، طاؤس؟

طاؤس: ایک یہ کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسرے اپنے بزرگوار رسول کریم ﷺ کی شفاعت آپ کو حاصل ہوگی۔ تیسرے خدا کی رحمت آپ کے ساتھ ہوگی۔

زین العابدین: طاؤس! رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے ہونا اخروی اطمینان کے لئے کافی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''قیامت کے دن باہمی نسب ختم ہو جائیں گے، شفاعت رسول ﷺ کے متعلق بھی اس کا یہ اعلان ہے کہ انبیاء صرف اس شخص کی شفاعت کریں گے جن کو اللہ پسند کرے گا، رحمت الٰہی کا معاملہ فرمان الٰہی کے مطابق یہ ہے کہ اس کی رحمت صرف نیک کاروں سے قریب ہوگی''۔

یہ فی البدیہہ جواب سن کر طاؤس ہکا بکا رہ گئے اور اپنے نظریہ میں نئی معلومات کا اضافہ کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔

حج کرنے والوں میں بصرہ کے عابدوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ مکہ میں امسال پانی کا قحط تھا۔ ہر چہار طرف پیاس بجھانے کے لئے پانی پانی کی صدائیں بلند تھیں کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی لوگ ایک دوسرے سے پانی مانگتے تھے مگر پانی کہاں حتیٰ کہ مکہ کے باشندے پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے، لوگوں نے بصرہ کے عابدوں سے درخواست کی کہ وہ اللہ سے بارش کی دعا مانگیں، چنانچہ وہ حضرات جمع ہوئے۔ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔ وقت گزرتا رہا مگر آسمان پر بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی نظر نہ آیا۔ لہٰذا لوگ تمام رات بے چین رہے اور پیاس دور کرنے کے لئے پانی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

دم بدم لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر ایک خاموش نوجوان پر پڑی جو زرد تھا، خوف الٰہی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے، گندم کی بالوں کی طرح متحرک جسم کے ساتھ طواف میں مشغول ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اندرونی بے چینی اور غم و آلام نے اس کو مضطرب کر رکھا ہے۔ لوگ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ تعاقب کرتی ہوئی مسلسل نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ جب اپنے طواف سے فارغ ہوا تو لوگوں کے ہجوم نے اس کو گھیر لیا۔ ہر شخص کی درخواست تھی ''اے نوجوان ہمیں پیاس نے مار ڈالا ہے۔ ہمارے لئے بارش کی دعا کر!''

نوجوان نے بصرہ کے عابدوں پر نظر ڈال کر پہچانتے ہوئے کہا ''تم نے کیوں بارش کی دعا نہیں مانگی'' کہنے لگے ''ہم نے بہت دعائیں مانگ لیں، قبول کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔''

نوجوان نے سب عابدوں کو یکے بعد دیگرے نام لے لے کر پکارا! اے مالک! اے ثابت! اے ایوب!۔۔۔۔'' پھر ان سے فرمایا ''تم لوگ کعبہ سے باہر نکل جاؤ۔ اگر تم میں ایک بھی مرد راہ ہوتا تو تم لوگوں کی دعا ضرور قبول ہوتی'' چنانچہ عابد و زاہد لوگ اس جگہ سے ہٹ گئے۔ نوجوان نے ترساں و لرزاں کعبہ کا طواف کیا۔ حزن و غم اس کی پیشانی سے نمایاں تھا، وہ کعبہ کی طرف بڑھا، نماز پڑھی اور سجدہ میں گر کر دعا مانگنے لگا۔ ابھی اس نے دعا پوری نہ کی تھی کہ آسمان پر ابر چھا گیا، اور دیکھتے دیکھتے زور کی بارش برسنے لگی۔ نوجوان نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ واپس ہوتے وقت اس کی زبان پر یہ شعر تھے۔

من عرف الرب فلم تغنه معرفة الرب فذاک الشقی ما ساء ذا الطاعة ما ناله فی طاعة الله وما ذا لقی ما یصنع العبد بغیرا التقی والعز کل العز للمتقی

''جو شخص خدا شناس ہو، لیکن اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہو تو وہ یقیناً بدنصیب ہے۔''

''عبادت گزار کو عبادت میں جو کچھ ملتا ہے وہ خسارہ کا سبب نہیں ہوتا''

''بندہ کسی کام کا نہیں ہوتا بغیر پرہیزگاری کے، کامل عزت صرف متقی کے ہی ہاتھ آتی ہے''

لوگوں نے نوجوان سے متعارف ہونے کے لئے مکہ والوں سے پوچھا'' یہ کون نوجوان ہے؟ مکہ والوں نے جواب دیا،

''تم ان کو نہیں پہچانتے؟ یہ زین العابدین علی بن حسین ہیں''

باپ کی حیات میں ہشام بن عبدالملک ولی عہد نے حج کا ارادہ کیا۔ حشم وخدم اور محافظوں کا اتنا ہجوم ہمراہ ہوا کہ سورج کی کرنیں زمین تک نہ پہنچ سکیں۔ لوگوں کے دل رعب وہیبت سے دہل گئے۔ ہشام شاہی محافظوں کے جلو میں وارد ہوا چاہتا تھا۔ والی مدینہ ہشام بن اسماعیل اپنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھا۔ غرض بیت الحرام تک ولی عہد کے پہنچتے پہنچتے شاہی رعب وجلال میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ اگر یہ تمام لوگ احرام کے کپڑے پہنے نہ ہوتے تو ہشام اور اس کے ہمراہیوں کے شاہی لباس کی وجہ سے غالباً دیکھنے والوں کا یہ تخیل ہوتا کہ کوئی بہت بھاری فوج حرم میں داخل ہوا چاہتی ہے۔

ولی عہد اور تمام غلام پیشہ طواف کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ہشام کی احرام پوش فوج نے آگے بڑھ کر شہزادے کے لئے راستہ وسیع کرنا چاہا، لیکن یہ خدا کا گھر تھا اور صرف خانہ خدا کی عظمت سے لوگوں کے دل معمور تھے۔ کسی نے شاہی محافظوں کی طرف التفات نہ کیا، لوگوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے پیچھے شہزادہ آرہا ہے نہ کوئی توجہ کی اور نہ راستہ چھوڑا۔ فوج نے بہت زور لگایا لیکن ہجوم کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔ ہشام کی آرزو تھی کہ حجر اسود تک پہنچے، لیکن یہ مسئلہ انتہائی دشوار ہو گیا۔ سر اٹھا اٹھا کر دور سے حجر اسود کو دیکھنا چاہا لیکن نہ دیکھ سکا، کیونکہ لوگوں کا ہجوم اس طرح حائل ہو گیا تھا جیسے کوئی پہاڑ حائل ہو گیا ہو۔

ہشام کے جلال عظمت کو سخت ٹھیس پہنچی، ہر شخص ہشام کو دیکھتا اور بے رخی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔ کچھ لوگ بغور اسے دیکھ کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ کیونکہ ہشام انتہائی بھینگا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی وقار نہ تھا، جو کوئی دیکھتا، اس کی نظروں میں خفیف ہو جاتا۔ حتیٰ کہ اس کے اہل شہر حمص والے بھی اس کو دیکھ کر ہنس دیتے۔ ان کی نگاہوں میں ہشام اور حمص کے ایک نعل بند ''عرون'' میں ایسی گہری مشابہت و یکسانیت موجود تھی، گویا چہرہ مہرہ میں عرون اور ہشام ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد حجر اسود کے قریب کھڑے ہونے والوں نے دور سے گرجدار تکبیر کی آواز سنی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ ان کے قریب آتی جارہی تھی۔ تکبیر کی یہ مسلسل آواز ایک ضعیف الجثہ اور نازک بدن انسان کو آگے لا رہی تھی، آواز برابر قریب ہوتی گئی۔ لوگوں کی تکبیر وتہلیل کی وجہ سے فضا میں ایک مہیب ارتعاش پیدا ہوا۔ گویا روئے زمین کا ہر متکلم اور خاموش انسان اس وقت تکبیر وتہلیل اور تلبیہ میں مشغول تھا۔ اب وہ بزرگ ہستی حجر اسود سے قریب ہو چکی تھی جس کے گرد تکبیروں کی آواز گونج رہی تھی۔ لوگوں نے دیکھا ایک دھان پان آدمی، چھریرا بدن، زرد رو، لرزاں ترساں، لیکن پرنور چہرے اور ہیبت وجلال کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ لوگوں نے اس کی مثل وظیر نہ دیکھی ہوگی۔ چہرہ آئینہ کی طرح شفاف کہ جس میں قبیلہ کی دوشیزائیں اپنے چہروں کا عکس دیکھیں۔ احرام کی چادر اور تہہ بند میں ملبوس سر جھکائے اور نگاہیں نیچی کئے آگے بڑھا۔۔۔۔ پیشانی پر سجدوں کا گہرا نشان قائم تھا۔ لوگوں کی صفوں میں انتشار ہوا۔ لوگ اس ہستی کو چلنے کے لئے کشادہ راستہ دے رہے تھے، تاکہ وہ حجر اسود کو بوسہ دے سکے۔

تکبیر کی آوازیں ہر طرف بلند تھیں، لوگوں کی نظریں اس بزرگ ہستی کو دیکھنے کے لئے ہر طرف بے قرار تھیں، گویا اس کی زیارت ان کی آنکھوں کے لئے سکون بخش سرمہ تھا، جو دیکھ لیتا، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھرکتے، جو نہ دیکھ پاتا وہ اپنی محرومی قسمت پر آنسو بہاتا۔ یہ نور بصیرت اب حجر اسود کے قریب پہنچ چکا تھا اور اطمینان سے اس کو بوسہ دے رہا تھا۔

ہشام کے لئے یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ اس کے وقار کا سوال تھا، اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑ اور چھوٹی سی چڑیا کا تقابل ہے۔ خود اس کے ہمراہی اور شاہی محافظ اس نووارد کی طرف متوجہ ہو کر اس منظر سے لطف لے رہے تھے۔ وہ اس آنے والے کو راستہ بھی دے رہے تھے اور تکبیر بھی کہہ رہے تھے۔

ہشام نے طواف کی جگہ سے پیچھے ہٹ جانا مناسب سمجھا، تاکہ لوگوں کا ہجوم اس سے مزاحم نہ ہو۔ وہ کچھ دور ہو کر کھڑا ہو گیا۔ زم زم کی

جانب حطیم میں اپنے لئے منبر بچھوایا اور لوگوں کے ہجوم سے کم ہونے تک اس پر بیٹھا رہا۔ وہ جوش غضب اور ناگواری سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ہجوم قدرے کم ہوا اور لوگوں میں اطمینان کی کیفیت ہوئی تو ہشام کے خاص مصاحبوں اور محافظوں میں سے کسی نے آکر ہشام سے پوچھا، ''یہ کون شخص ہے جس کا لوگ اس قدر اعزاز و اکرام کر رہے ہیں۔''

ہشام نے جواب دیا، ''میں نہیں جانتا''

ہشام اپنے اس جواب میں جھوٹا تھا، وہ اس کو خوب جانتا تھا۔ لیکن اس کو اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ان لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی عظمت کا سکہ نہ بیٹھ جائے۔ اور لوگ اس گرویدگی کے نتیجہ میں کہیں اس کو اپنا بادشاہ تسلیم نہ کر لیں، ہشام اس سفر حج میں یہ خیال کر کے نکلا تھا کہ اگر زین العابدین ؑ کا اور اس کا کسی موقعہ پر سامنا ہوا تو وہ علی بن حسین ؑ پر غلط انداز میں نگاہیں ڈالتا ہوا اور اپنے مصاحبوں اور محافظ فوج کے دل میں علی بن حسین ؑ اور بنی ہاشم کی قدر و منزلت کو پست کرتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس محافظ سپاہی کا سوال بھی تجاہل پر مبنی تھا۔ وہ ہشام کو ٹٹولنا چاہتا تھا اور اس کا جواب سن کر دل لگی کرنا چاہتا تھا۔ علی بن حسین ؑ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ کسی شخص کو تعارف حاصل کرنے کے لیے ان کے متعلق دوسروں سے پوچھنا پڑے، وہ ہر سال اس طرح احرار اور آزاد شدہ غلاموں کے جھرمٹ میں دعا و تلبیہ کرنے تشریف لایا کرتے تھے، تکبیر و تہلیل کرنے والوں کا ایک ہجوم گرجتے اور برستے بادلوں کی طرح ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

ناواقفیت کے انداز میں ہشام کا جو جواب تھا وہ وہیں ختم نہیں ہو گیا۔ بات چل پڑی اور تقریباً سب ہی کو معلوم ہو گئی، قبائل کے سرداروں کی ایک جماعت جو مطاف سے علیحدہ دور کھڑی ہوئی تھی۔ ہشام کے اس تجاہل عارفانہ کی تہہ کو پہنچ گئی۔ ان کے دلوں میں اہل بیت کے خاندان کی عظمت تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ ان میں اس وقت ہمام بن غالب ابوفراس فرزدق شاعر بھی موجود تھا، وہ ستر سال کی عمر میں تھا لیکن اہل بیت کی محبت اس کے دل سے کم نہ ہوئی تھی۔ جب اسے زین العابدین کی شخصیت کے بارے میں ہشام کے انکار کرنے کا حال معلوم ہوا تو غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے گرد جمع ہونے والے ہمراہیوں نے کہا، ابوفراس کیا بات ہے؟ کہنے لگا، ''تم نے جھگڑے کی بات نہیں سنی؟'' لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ''اچھا ہے فرزدق جوش میں آجائے، جواب دیا۔'' ابوفراس پھر تم ہی اس کو متعارف کرا دو۔'' فرزدق کی تیوری کے بل دیکھنے کے قابل تھے۔ وہ سمندر کی طرح جوش میں آگیا اور یہ بھی بھول گیا کہ ابھی طواف کے کچھ چکر پورے کرنے ہیں۔ اس نے شعر کہے:

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته

والبیت یعرفه والحل والحرم

''یہ وہ ہستی ہے جس کے قدموں سے بطحاء کی سرزمین روشناس ہے۔ بیت اللہ بھی اس سے واقف ہے اور حل و حرم بھی۔''

آواز آئی ابوفراس! مکرر، ذرا اونچی آواز میں۔ فرزدق نے آواز اٹھائی اور کہا:

هذا ابن خیر عباد الله کلهم

هذا التقی النقی الطاهر العلم

یکاد یمسکه عرفان راحته

رکن الحطیم اذا ما جاء یستلم

''یہ تمام بندگان خدا میں اشرف ترین ہستی کی اولاد ہے۔ متقی، پاکیزہ دل، عیوب سے پاک اور علوم کا جامع ہے۔ وہ جس وقت رکن حطیم کا استلام کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو حطیم اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔''

اذا رأته قریش قال قائلها

الی مکارم هذا ینتهی الکرم

''قریش کے لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے حسن اخلاق پر مکارم اخلاق ختم ہیں۔''

طواف کرنے والوں نے سنا، کہ کوئی شاعر نہایت شیریں اور دلچسپ شعر پڑھ رہا ہے۔ اخلاص و جذبات سے فی البدیہ شعر اس طرح سنا رہا ہے گویا وہ اسے پہلے سے یاد ہیں اور اشعار کا مضمون اس کا عقیدہ ہے۔ ہر چہار طرف سے لوگ سمٹ آئے، آوازیں آنے لگیں۔ شاعر! ذرا اونچی آواز میں پڑھو، ہم بھی سنیں۔ بعض نے پوچھا یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ فرزدق ہے۔ لوگ فرزدق کا نام سن کر کلام سننے کو بے تاب ہو گئے۔ انہوں نے شاعر عرب کی زبان سے سید العرب والعجم کی شان میں اشعار سننے کو اپنی خوش بختی تصور کیا۔ کہنے لگے ابوفراس، تمہیں خدا کی قسم

دیتے ہیں اپنی آواز اونچی کرو۔ فرزدق نے آواز اٹھائی۔ اس کے ہاتھ کے اشارے گویا لوگوں پر اشعار کی بارش کر رہے تھے اور اس کی آواز صحن حرم کے در و بام سے ٹکراتا ہوا شیریں نغمہ تھا۔ اس نے کہا

هذا ابن فاطمه اب کنت تجهله

بجده انبياء الله قد ختموا

''اگر تو نہیں جانتا تو میں بتلاتا ہوں، یہ فاطمہ کا بیٹا ہے اس کے نانا پر خدا کے پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔''

يغضى حياءً و يغضى من هابته

فما يكلم الاحين يتبسم

''اس کی نگاہیں حیا سے نیچی رہتی ہیں اور لوگوں کی نگاہیں اس کی ہیبت سے۔ اس کی خندہ روئی کے علاوہ دیگر اوقات میں کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ينشق نور الهدى عن صبح غرته

كالشمس تنجاب عن اشراقها الظلم

''اس کی روشن پیشانی سے ہدایت کی کرنیں اس طرح پھوٹتی ہیں جس طرح سورج کی روشنی سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔''

ہر طرف سے احسنت و مرحبا کے ڈونگرے برسنے لگے، فرزدق رواں دواں اپنے قصیدہ کو گا رہا تھا۔ حرم کا صحن عکاظ کا میلہ معلوم ہونے لگا۔ لوگ طواف کو بھی بھول گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ فرزدق کے پاس زین العابدینؑ کے آدمی نے پہنچ کر کہا

''علی بن حسینؑ کے متعلق تم نے جو اشعار کہے ان کا واقعہ علی بن حسینؑ کو معلوم ہوا، یہ ایک ہزار دینار انہوں نے تم کو بھیجے ہیں، فرزدق نے عطیہ واپس کرتے ہوئے کہلایا، ''میرا قصیدہ خدا کی خوشنودی کی خاطر تھا۔ آپ سے عطیہ و انعام پانے کے لئے نہ تھا۔''

قاصد دوبارہ واپس آیا کہ علی بن حسینؑ یہ رقم واپس لینے کو تیار نہیں۔ فرماتے ہیں

''ہم اہل بیت کوئی چیز دے کر واپس نہیں لیتے۔'' اس کے بعد فرزدق نے مجبور ہو کر عطیہ رکھ لیا۔

حج کا موسم ختم ہوا۔ فرزدق مدینہ کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ عسفان کا چشمہ جہاں سرسبز چراگاہ اور کھجور کے باغات تھے اور جو مکہ و مدینہ کے درمیان سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا۔ فرزدق نے وہاں پہنچ کر دیکھا، شاہی فوج راہ میں حائل ہے۔ گزرنے والوں کی تفتیش اور پڑتال ہو رہی ہے۔ لوگوں کو پہچاننے کے بعد گزرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ فرزدق گزرنے لگا تو اس کو پہچانتے ہوئے ہشام بن عبدالملک کی ہدایت کے مطابق گرفتار کر لیا گیا اور ایک قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ فرزدق اس ناروا سلوک پر بھڑک اٹھا اور ہشام کی ہجو میں کہا۔

ايحبسني بين المدينة والتى

اليها قلوب الناس يهوى هيبها

يقلب داما لم يكن راس سيد

و عيناله حولاء بار عيوبها

''کیا مجھے مدینہ اور اس پار سرزمین حرم کے درمیان قید کیا جا رہا ہے جس کی طرف عشق الٰہی میں ڈوبے ہوئے دل متوجہ ہوتے ہیں۔ ہشام کا سر ایک سردار کا سر نہیں۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں کس قدر کھلا عیب ہے۔''

ہشام بن عبدالملک دمشق واپس ہوا اور باپ سے تمام واقعات دہرائے۔ ہشام کے مصاحبوں نے بھی جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، گوش گزار کیا۔ ان لوگوں نے زین العابدین کی عظمت و جلال ایسے آراستہ الفاظ میں بیان کی کہ عبدالملک کو ان کی طرف سے خطرہ ہوا کہ زین العابدینؑ کہیں خلافت کے مدعی ہو کر خروج نہ کر بیٹھیں۔ شہزادہ وغیرہ نے اسے بتایا کہ اگر زین العابدینؑ نے بیعت لی تو عربی، عجمی، کالے اور گورے سب ہی اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔

عبدالملک اس معاملہ میں بڑا محتاط واقع ہوا تھا۔ فوراً مدینہ حکم بھیجا کہ زین العابدینؑ کو پابہ زنجیر دمشق روانہ کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی، زین العابدین اس حالت میں مدینہ سے روانہ ہوئے کہ ان کے پاؤں میں زنجیر، ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں بھاری آہنی طوق پہنایا گیا تھا۔ اسی حالت میں زین العابدینؑ دربار خلافت میں پہنچے لیکن نہ عبدالملک نے کچھ پوچھا، اور نہ زین العابدین کچھ بولے، وہ اس پر

مردہ شاخ کی مانند ہو رہے تھے جس کو بادِ سموم کے تھپیڑوں نے جھلس کر رکھ دیا ہو۔ لیکن وہ ان تمام حالات میں بھی عبادت و مناجات میں مشغول رہے۔ محویت کا یہ عالم تھا گویا نہ پاؤں میں بیڑی ہے۔ نہ ہاتھوں اور گلے میں ہتھکڑی اور طوق ہے۔ عبدالملک نے ان کو اس حالت میں دیکھا تو اس پر ہیبت طاری ہوگئی، اس نے درباریوں کو مشورہ کے لئے طلب کیا۔ محمد بن مسلم زہری دربار میں حاضر تھے۔ عبدالملک سے عرض کی، کہ علی بن حسینؓ کا کوئی ایسا موقف نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ان کے خلاف بدگمانی کو دل میں جگہ دیں۔ وہ عبادت الٰہی میں اس قدر محو ہیں کہ ان کو اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ عبدالملک نے یہ مشورہ قبول کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور کہا ٹھیک کہتے ہو، واقعی ان کی محویت کا یہی عالم ہے۔'' غرض زین العابدینؓ کی رہائی کے احکامات جاری ہوئی اور پورے احترام و اعزاز کے ساتھ مدینہ واپس کردے گئے۔

فرزدق نے ہشام کی ہجو میں جو اشعار کہے وہ ہشام کو بھی معلوم ہوئے، وہ ڈرا کہیں مزید ان پر اضافہ نہ ہو جائے۔ اس نے معافی کے احکام صادر کرتے ہوئے رہائی کا حکم دیا۔ فرزدق نے زین العابدینؓ کی شان میں جو قصیدہ کہا تھا۔ حاجیوں کی زبانی مشرق و مغرب کے تمام اسلامی شہروں میں مشہور ہوگیا۔ لوگوں نے یاد کیا اور زمانہ کے کانوں نے سنا اور ایک عرصہ تک لوگوں کی اولاد در اولاد در زمانہ بزمانہ پڑھا جاتا رہا۔

گو فرزدق نے اپنے وجدان و شعور کو ان اشعار میں سمویا ہے۔ لیکن لوگ کہہ رہے تھے علی بن حسینؓ کی اس مدح کے صلے میں خداوند تعالیٰ فرزدق کو بخش دے گا۔

طاعون فتیات میں، ولید بن عبدالملک اپنے باپ کے وفات پا جانے کے بعد سریر آرائے خلافت ہو چکا تھا۔ ولید نے اپنی خلافت کے زمانہ میں یہ پالیسی مقرر کی کہ مدینہ کے باشندوں کو راضی کیا جائے۔ خصوصاً زین العابدین اور تمام اہل بیت کو ہشام مخزومی کے ظلم واستبداد سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ اس کو معزول کرتے ہوئے قریش کے ایک نوجوان امیر زادہ عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کا والی مقرر کیا گیا جن کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ ہشام مخزومی کے بارے میں یہ حکم بھی پہنچا کہ اس کو بر سر عام کھڑا کر دیا جائے کہ اس کے ہاتھوں جس کو جس قدر تکلیف پہنچی ہو، وہ آ کر اپنا بدلہ لے لے۔

ہشام مخزومی کو ولید کے حکم کے مطابق مروان بن حکم کے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہر شخص گالی کا بدلہ گالی سے، لعنت کا لعنت سے اور طمانچہ کا طمانچہ سے لے سکتا ہے۔ چنانچہ لوگ گالیاں دیتے اور لعنت کرتے ہوئے گزرنے لگے۔ مدینہ میں اب کوئی شخص باقی نہ رہا، قریب قریب سب نے گالیوں اور لعنت کا اپنا بدلہ لے لیا تھا۔

ہشام کو اہل بیت اور خصوصاً زین العابدینؓ سے بہت خوف تھا۔ کیونکہ سب سے زیادہ ان ہی لوگوں کو اس نے ستایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زین العابدینؓ اس کو قتل کر ڈالیں گے، اگر وہ خود قتل نہ کریں گے تو ان کا کوئی موالی ضرور قتل کر دے گا۔ لیکن ہشام کے پاس اہل بیت یا موالی میں سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا، لہذا اب اس کو سخت دھڑکن لگی ہوئی تھی اور وہ ایک بلائے ناگہانی کا منتظر تھا۔

دن ڈھل چکا تھا، شام کی زردی ہر طرف بکھری ہوئی تھی کہ زین العابدینؓ اپنے اہل بیت اور موالی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہشام کا دل بہت مضطرب تھا۔ اس کو اپنی موت قریب آتی نظر آ رہی تھی۔ زین العابدینؓ پہنچے تو اس نے اپنی گردن جھکالی۔

زین العابدینؓ نے فرمایا،

السلام علیک، یا ہشام!'' اپنے ہاتھ انہوں نے مصافحے کے لئے آگے بڑھائے اور اس کی کمر کو تھپکا۔ ہشام نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور خود کو سپرد کرتے ہوئے سر جھکا کر رونے لگا۔

زین العابدینؓ نے فرمایا، ''اگر تمہیں کوئی حاجت درپیش ہو تو بتاؤ میں پوری کروں گا اور اگر سرکاری قرضہ ہو تو میں وہ بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

ہشام یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، وہ کہہ رہا تھا

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

''خدا ان بہترین مواقع کو خوب سمجھتا ہے، جن کو وہ پیغمبری کے لائق سمجھتا ہے۔''

زین العابدینؓ چلے گئے ان کے ہمراہ ان کے مصاحب اور اہل بیت بھی چلے گئے۔ کسی نے بھی ہشام کو کسی بات کے ذریعے کوئی تکلیف نہیں دی کیونکہ ان کو زین العابدینؓ نے پہلے ہی روک دیا تھا اور فرمایا تھا'' وہ بیوقوف ہے معزول شدہ آدمی ہے ضعیف لوگوں کے دل کو ستانا اچھی بات نہیں۔'' اہل بیت کے رکنے سے تمام اہل شہر نے بھی ہشام بن اسماعیل مخزومی کو اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مدینہ کی گلیوں میں منادی پکار رہا تھا کہ "علی بن حسینؑ کے یہاں کھانے کی دعوت ہے۔ دعوت عام ہے۔ رشتہ داروں، دوستوں، غریبوں اور مسکینوں سب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ دستر خوان پر ہر شخص بلا روک ٹوک پہنچ سکتا ہے۔ ہر شخص کے لئے علیؑ کے دروازے کھلے ہیں۔ کھانے کی تیاری میں علی بذاتِ خود لوگوں کا استقبال کریں گے ان کے موالی کھانا پکانے میں مشغول ہیں۔"

جب کھانے کا وقت ہو جاتا ہے تو اہل مدینہ اور مسافروں میں سے جس کا دل چاہتا پہنچ جاتا۔ لیکن علی بن حسینؑ نے محسوس کیا کہ بہت سے فقرائے مدینہ جن کو وہ بذاتِ خود جانتے پہچانتے تھے۔ دستر خوان پر حاضر نہیں ہوئے۔ لہٰذا صورت حال یہ قرار دی کہ علیؑ نے کھانے کے دو حصے کئے، ایک حصہ وہ خود کھاتے اور مہمانوں کو کھلاتے اور دوسرا حصہ لے کر ان لوگوں کے گھروں پر حاضر ہوتے اور انہیں اختیار دیتے کہ خواہ وہ کھانا لے لیں اور خواہ وہ مال لے لیں۔

علی بن حسینؑ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ وہ دستر خوان پر آئے اور نہ انہوں نے کوئی چیز لی۔ انہوں نے اپنی غربت کو عفت و ناموس کے پردے میں چھپانے اور شکموں کو بھوکا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ علی بن حسینؑ نے اب ایک تیسرا حصہ اور علیحدہ کیا۔ کچھ کھانا اور کچھ مال لے کر وہ رات کی تاریکی میں چادر اوڑھ کر نکلتے۔ لوگوں کے دروازے پر پہنچتے۔ ایک ہاتھ میں درہم و دینار کا تھیلا ہوتا اور کمر پر کھانے کی بوری ہوتی، دروازے کھٹکھٹاتے اور اس طرح ان لوگوں کو کھانا اور مال دیتے کہ نہ وہ ان کو پہچان سکتے اور نہ یہ پوچھ پاتے کہ آپ کون ہیں؟ مدینہ میں اس پوشیدہ خیرات کا چرچا ہونے لگا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ زین العابدینؑ کے اہل بیت اور دوست، احباب زین العابدینؑ کو شکوہ کرتے کہ وہ ہماری مدد نہیں کرتے، البتہ رات کو کوئی صاحب دل چھپ کر آتا اور ہماری مدد کرتا ہے۔ زین العابدینؑ ان کی ان مذمتوں کو اپنے کانوں سے سنتے لیکن خاموش رہتے۔ وہ اس راز کو ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے کہ وہ شخص میں ہی ہوں تا کہ اس طرح ثواب و اجر برباد نہ ہو اور لوگوں کی مذمتوں کی وجہ سے جو ان کو ثواب ہو رہا ہے وہ اس سے محروم نہ رہیں۔

علی بن حسینؑ ایک رات میں مستور الحال غریبوں کے تقریباً سو دروازے کھٹکھٹاتے، ان کی کمر پر کھانے کی بوری ہوتی۔ وہ اپنے ہمراہ غلاموں یا کنیزوں کو نہ لے جاتے تھے کیونکہ اس طرح لوگوں کی پاک دامنی اور عزت نفس پر حرف آتا تھا۔

جود و کرم کا یہ جذبہ اس قدر مخلصانہ ہوتا تھا کہ اگر ان کو لوگوں پر حاکم بنا دیا گیا ہوتا یا وہ مدینہ سے باہر دوسرے شہروں میں ہوتے تو وہ اس وقت بھی اپنی کمر پر اٹھا کر لوگوں کو کھانا پہنچانے میں کوئی دریغ نہ کرتے اور کوشش یہی ہوتی کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

حسب معمول ایک روز کھانے کا دستر خوان بچھا ہوا تھا، ہر قسم کے لوگ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ زین العابدینؑ سب کی میزبانی اور پوری پوری رعایت کر رہے تھے۔ وہ اگر کسی شخص کو دیکھتے کہ اس کو کھانے میں کچھ شرم و حیا مانع ہے تو اس کا حوصلہ بڑھاتے اور بے تکلف کھانے کی ترغیب دیتے، اگر کوئی مریض نظر آتا تو اپنے ہاتھ سے روٹی کے ٹکڑے توڑتے ہوئے لقمے بنا بنا کر اس کے منہ میں دیتے۔ ایسا کرنے میں کوئی حجاب یا تکبر محسوس نہ کرتے۔ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور زین العابدین جدھر جاتے ادھر ہی نگاہیں گھوم جاتیں۔

غرض مہمانی کا بازار گرم تھا کہ کسی بلند آواز میں پکارنے والے نے منادی کی "اے خاندان نبوت کے مقتدا، رسالت کے مخزن، وحی و ملائک کے گھرانے کے سرتاج! میں مختار ثقفی کا ایلچی ہوں اور عبیداللہ بن زیاد کا سر لے کے حاضر ہوا ہوں۔"

لوگوں نے کھانا کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بنی ہاشم کی عورتیں چلمنوں کی طرف دوڑ پڑیں۔ ایلچی اس شان سے داخل ہوا کہ نیزہ سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ جس وقت زین العابدینؑ کے سامنے آیا تو یہ سر اس نے ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ زین العابدینؑ نے آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا: "اس مکروہ سر کو میرے سامنے سے دور کر دو۔" پھر وہ مسکرائے اور ہنس پڑے، جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے، ان کو کبھی بھی ہنستے ہوئے نہ دیکھا گیا تھا، مگر آج کا دن اس سے مستثنیٰ تھا!

اس سے پیشتر حال یہ تھا کہ کھانے کا وقت تو عام لوگوں کے دروازے مہمانی کے لئے وا کر دیئے جاتے۔ کھانا ان کے لئے لایا جاتا مگر ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ ایک روز ایک مولیٰ نے کہا: "اے ابن رسول! کیا آپ کے غم ناک دور کے خاتمے کا وقت نہیں آ گیا؟" فرمایا! "کیسی باتیں کرتے ہو، یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ایک گم ہو گیا تو اس کی جدائی میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں۔ حالانکہ ان کو یقین تھا کہ یوسف اسی عالم میں زندہ ہیں۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ، بھائی، چچا اور خاندان کے سترہ آدمیوں کے علاوہ باپ کے انصار میں سے بیسیوں کو اپنے ارد گرد تہ تیغ ہوتے دیکھا ہے۔ میرا غم کیسے ختم ہو جائے گا۔"

زین العابدینؑ کی یہ ہنسی خوشی کی ہنسی نہ تھی کیونکہ ان کی مسرتیں ان سے چھن چکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنے والد کا وہ وقت یاد آیا جس وقت وہ ان کو بیماری کی حالت میں دل بہلانے کے لئے فرما رہے تھے: "بیٹا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟ ہمیں بتاؤ۔" لیکن بیٹے کا نہ کسی

چیز کو جی چاہا تھا اور نہ کوئی چیز انہوں نے مانگی تھی، البتہ ایک خواہش ضرور دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ انہوں نے اللہ سے دعا مانگی تھی، کاش ایک وقت وہ بھی کھانا کھاتے ہوں اور قاتلوں کا سر ان کے قدموں میں پڑا ہوا ہو۔ خداوند تعالیٰ نے ان کی یہ دعا عبیداللہ بن زیاد کے حق میں قبول کر لی تھی۔

اسی روز ملک شام سے پھلوں میں لدے ہوئے علی بن حسین ؑ کے کچھ اونٹ آئے، ابن زیاد کے مقتول سر کے لائے جانے سے پیشتر ان اونٹوں کے آنے کی خبر علی بن حسین کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ مقتول کا سر پیش ہونے کے بعد تجارتی کارندوں سے فرمایا: "جاؤ ان پھلوں کو اہل مدینہ میں تقسیم کر دو، اور ہر دروازے پر دستک دے کر پہنچا دو"

علی بن حسین ؑ صرف مستور الحال لوگوں کے دروازوں پر ہی اپنے صدقات لے کر نہیں جاتے تھے، بلکہ وہ مریضوں کے پاس بھی عطایا اور ہدایا لے کر پہنچتے تھے۔ حضرات صحابہ اور مہاجرین و انصار کی اولاد کو خصوصیت سے یاد رکھتے تھے، کیونکہ یہ لوگ سابقین میں سے تھے، اس لیے فضل و احسان کے بھی مزید مستحق تھے۔ انہیں ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ محمد بن اسامہ بن زید سخت بیمار ہیں۔ وہ فوراً ان کی عیادت کو پہنچے، دیکھا کہ آخری وقت ہے اور وہ رو رہے ہیں۔

زین العابدین ؑ نے فرمایا: "کیا حال ہے، کیا موت سے گھبرا رہے ہو؟"

محمد بن اسامہ نے جواب دیا: "زین العابدین! مجھ پر قرض بہت ہے اور گھر والے تنگی میں مبتلا ہیں، ڈرتا ہوں کہ اگر مر گیا تو یہ قرض کیسے ادا ہوگا؟"

زین العابدین ؑ نے پوچھا: "قرض کس قدر ہے؟" "پندرہ ہزار دینار" علی نے فرمایا، ابن اسامہ! کوئی فکر نہ کرو، قرض میں ادا کر دوں گا، نیز امید ہے کہ تم کو آرام نصیب ہو جائے گا۔"

اس کے بعد محمد بن اسامہ کی وفات ہو گئی اور زین العابدین ؑ نے ان کا تمام قرض ادا کر دیا۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے حالات بدل چکے تھے۔ ظاہر و باطن کے دو مختلف چہرے تھے، لوگ بنو امیہ کے پاس جاتے تو بنی ہاشم کی برائیاں کرتے اور بنی ہاشم کے پاس باریابی ہوتی تو بنی امیہ کی رسوائیاں گنواتے۔ دو رخی غفلت میں لوگوں نے دو رخی کو اپنا لیا تھا۔ علی بن حسین ؑ لوگوں کی اس مذموم عادت سے ناواقف نہ تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کا دھارا اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ غالباً لوگوں کی اس دو رخی کو کبھی پنپنے نہ دیتے۔ لیکن وقت کا بہاؤ اس تیزی سے دوسری سمت جا رہا تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے، بجز اس کے انہوں نے لوگوں کی نفاق آمیز باتوں سے اپنے کانوں کو بہرا بنا لیا تھا۔

ایک روز ان کی خدمت میں کچھ لوگ اسی قسم کے حاضر ہوئے، دوران گفتگو صحابۂ رسول پر چھینٹے پھینک رہے تھے۔ تمام باتیں اس قسم کی تھیں کہ خواہ مخواہ سننے والے کو ان کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو۔ زین العابدین نے ان لوگوں کی اس بکواس کو زیادہ آگے نہ چلنے دیا، بلکہ ان کی گفتگو کو بیچ ہی میں قطع کرتے ہوئے فرمایا: "اچھا ایک بات بتاؤ گے؟"

کہنے لگے: "وہ کیا بات ہے؟"

فرمایا، کیا تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے مال چھنے، گھر لٹا، لیکن انہوں نے اللہ کی خوشنودی و مہربانی کی طلب میں سب کچھ گوارا کر لیا اور وہ اللہ اور رسول کے لئے اپنا وطن چھوڑنے پر راضی ہو گئے؟"

کہنے لگے: "نہیں"۔

فرمایا: "اچھا ان لوگوں میں سے ہو جن کے متعلق فرمایا ہے کہ انصار وہ خدا دوست جماعت ہے جس نے ایمان کو اپنے دلوں میں بسایا، مہاجرین کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آئے ان پر اپنے مال خرچ کرنے میں ان کو کوئی کوفت محسوس نہ ہوئی بلکہ مہاجروں کو تنگدستی کی حالت میں بھی انہوں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا۔"

کہنے لگے "نہیں"۔

زین العابدین ؑ نے فرمایا: "اپنے اقرار کے مطابق گویا تم ان دونوں فریقوں سے نہیں ہو! اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہو، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، مہاجرین و انصار کے بعد ہمیں وہ لوگ بھی پسند ہیں جو ان کے بعد آئے۔ وہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ "الٰہی ہمارے اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو دنیا سے ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہو چکے۔ ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کر! خدا تمہیں سمجھے، جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ۔"

زین العابدین ؒ کا یہ عتاب منافقوں پر بجلی بن کر گرا، وہ وہاں سے لجاتے اور شرماتے ہوئے باہر نکل گئے۔ لیکن اس کے بعد کبھی کسی کو اصحاب رسول کی شان میں کوئی نامناسب بات منہ سے نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اجتماعی ماحول کے متعلق علی بن حسین ؒ کی یہ پختہ رائے تھی کہ لوگوں کو فضائل اخلاق کی طرف زور اور تسلط سے نہیں موڑا جا سکتا، بلکہ اس کا مؤثر طریقہ محبت و دل جوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں سے معاملات اور ان کے افکار کی روش کے لئے کچھ اساسی اصول کی وضع و تدوین کی فکر میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرہ مجموعی طور پر اخلاقی قدروں میں بھی مضبوط ہو۔ وہ ہرگز یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس اصول کو جوش و غضب اور انتہا پسندی کا جامہ پہنایا جائے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اخلاق و انسانیت کا احترام مفقود ہوتا جا رہا ہے ایسی حالت میں اگر اخلاقی بلندی کے بجائے زور اور جبر سے کام لیا گیا تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہ ہوگی وہ شب و روز خدا کے حضور میں ان حالات کی درستی کے لئے دست بدعا تھے۔

وہ اپنے اردگرد کے انسانوں اور وقت کی تبدیلی کو دیکھ رہے تھے کہ اجتماعی معاشرہ کی بندشیں ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اولاً علی بن حسین ؒ نے اہل قلم اور پڑھے لکھے غلاموں کو وہ حقوق لکھوائے جن کو اسلام اپنی تعلیمات میں جگہ دیتا ہے۔ یہ وہ حقوق تھے جن کو اسلام ماضی قریب میں انسانوں کی حمایت کے لئے لے کر آیا تھا۔ لیکن ذہن و ضمیر میں ان کی قدر و قیمت نہ رہنے کی وجہ سے اب ان کی بربادی کا وقت آ گیا تھا!

علی بن حسین ؒ کے خیال میں حریت کا مفہوم یہ نہ تھا کہ معاشرہ حرص و ہوس کی نذر ہو کر ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔ بلکہ حریت یہ تھی کہ اخلاق فاضلہ میں اس قدر بلندی پیدا ہو کہ تمام حقوق پورے ہوں۔ معاشرہ کو فرائض انسانی کا ہر وقت خیال رہے۔ باہمی روابط میں استحکام ہو، وہ روابط ہر چہار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان اور اس کے خالق کے درمیان، حاکم و رعایا کے درمیان، استاد و شاگرد کے درمیان، زوجی خاوند کے درمیان، باپ، بھائی اور اولاد کے درمیان، آقا و غلام کے درمیان، انسان اور اس کے بھائی دوسرے انسان کے درمیان، انسان اور خود اس کی ذات کے درمیان، اس کے طبعی میلاد و عقل کے درمیان حتیٰ کہ جسمانی اعضاء کے درمیان غرض تمام امور میں کچھ ایسے قومی روابط ہیں جن کے متعلق اسلام نے کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور ان کا بجالانا نہایت ضروری ہے۔

یہ وہی حقوق ہیں جو ایک دوست کے دوست پر، مسافر کے اپنے رفیق سفر پر، ایک پڑوسی کے دوسرے پڑوسی پر، ایک مالی یا تجارت شریک کے دوسرے شریک پر، قرض خواہ کے قرض دار پر، مدعی کے مدعی علیہ پر، ناصح مشفق کے اپنے مخاطب پر، بڑے کے چھوٹے، اور چھوٹے کے بڑے پر، سائل کے مسئول پر، اہل اسلام کے ذمیوں پر، حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات پر عائد ہوتے ہیں۔

امام سجاد زین العابدین ؒ نے دیکھا کہ لوگ عبادت الٰہی میں مختلف الخیال ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو خدا کی عبادت اس کے خوف و ہیبت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ لیکن یہ تخیل ان کو پسند نہ آیا، کیونکہ یہ غلامانہ بندگی تھی کہ جس میں نیکی کا تصور خوف و دہشت پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ ان عبادت گزاروں کا دیکھا جو رغبت اور لالچ سے اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اس گروہ کی طرف انتساب کو بھی پسند نہ کیا، کیونکہ یہ ایک قسم کی تاجرانہ عبادت تھی کہ جس میں نیکی کا تصور محض لالچ کے خیال پر مبنی تھا۔ انہوں نے ان عابدوں کے تخیل کو بہت بلند پایا جو اللہ کی عبادت صرف شکر و حمد کے لئے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تخیل قابل داد اور لائق عمل تھا۔ کیونکہ یہ خالصتاً احرار کی عبادت تھی۔

چنانچہ علی بن حسین ؒ نے عبادت الٰہی کی بنیاد شکر و حمد پر رکھی، وہ اس میں اس قدر اخلاص کیش تھے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز ان کے نزدیک گرویدگی کا باعث نہ تھی۔ وہ ایک مرتبہ نماز میں مشغول تھے، زلزلہ آیا اور ختم ہو گیا لیکن نہ وہ اس سے متاثر ہوئے اور نہ اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے کہ گھر میں آگ لگی اور ہر چہار طرف پھیل گئی۔ گھر والے چیخ چیخ کر ان کو باہر نکل جانے کو بلا رہے تھے، لیکن وہ سجدے سے نہ اٹھے اور باطمینان نماز پوری کی، اس عرصہ میں لوگوں نے آگ پر قابو پا کر اس کو بجھا دیا تھا۔

گھر والوں نے کہا، "آپ نے ہماری آوازوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی، حالانکہ آگ تمام گھر میں بھڑک اٹھی تھی؟" فرمایا، "مجھے ایک دوسری آگ کے خیال نے اس طرف سے غافل کر رکھا تھا۔"

علی بن حسین ؒ کا ایک ایک دن عبادت و خلوت نشینی میں اضافہ کے ساتھ گزر رہا تھا۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد وہ انتہائی نڈھال اور کمزور ہو جاتے۔ ان کے قویٰ میں یہ ضعف و انحطاط روز افزوں تھا۔ ایک روز ان کے صاحبزادہ محمد نے ان کی یہ کیفیت محسوس کی عرض کیا، "ابا جان! مجھے وصیت فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا، "پانچ قسم کے آدمیوں کی ہم نشینی، گفتگو اور رفاقت سے احتراز کرنا"

صاحب زادہ:۔ ابا جان! وہ کون پانچ شخص ہیں؟

علی بن حسین:۔ فاسق سے بچو، وہ تمہیں ہوس کار بنا ڈالے گا۔

''ابا جان! ہوس کاری سے کیا مراد ہے؟''

''ہوس کاری سے مراد یہ ہے کہ انسان لا حاصل چیزوں کی طمع کرنے لگے۔''

''ابا جان! دوسرا کون شخص ہے۔''؟

بخیل شخص کی دوستی سے اجتناب کرنا، کیونکہ ایک ایسے وقت میں جب کہ تم کو مال کی شدید ترین ضرورت ہو رہی ہوگی۔ وہ محض اپنے مال کی خاطر تم سے بے تعلق ہو جائے گا۔''

''ابا جان! تیسرا کون شخص ہے؟''

جھوٹے آدمی کو بھی دوست نہ بنانا۔ وہ ایک سراب ہوتا ہے۔ وہ تم سے عزیزوں کو بیگانہ اور بیگانوں کو عزیز کردے گا۔''

''ابا جان! چوتھا کون شخص ہے؟''

احمق کو کبھی دوست نہ بنانا۔ وہ دوستی میں تم کو فائدہ پہنچانا چاہے گا، لیکن حقیقت میں تم پر ظلم کرے گا۔''

ابا جان! پانچواں شخص بھی بتلایئے!''

''قطع رحمی کرنے والے انسان سے کبھی تعلق نہ رکھنا، کیونکہ میں نے کتاب الٰہی میں ایسے شخص کو تین جگہ ملعون پایا'' چونکہ صاحبزادہ وہ تین مواقع جانتے تھے، اس لیے تشریح نہیں چاہی۔

اسلامی فوجیں مشرق ومغرب میں فتح وکامرانی کی منزلیں طے کرتی اور دشمنوں کے قلعوں اور چھاؤنیوں کو زیروزبر کرتی آگے بڑھ رہی تھیں، خدائے شر (اہرمن) بحال تباہ ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ خدا کی مخلوق کو اس پرستش سے خلاصی اور دلوں کو اطمینان کی سانس لینے کی فضا نصیب ہو رہی تھی۔ وہ اب اپنے آپ کو عدل وخیر کے مالک، اللہ رب العزت کے سامنے دعا وشکر میں مشغول سجدہ ریز پا رہی تھی۔

عرب فوجیں مشرق میں ہندو وسندھ کی سرحدوں کو عبور کر چکی تھیں۔ دوسری طرف چین کی دیواروں کے مضبوط دروازوں پر دستک دی جا رہی تھی۔ اگر کسی قلعہ کے محاصرہ میں طول کھینچتا تو فوج کا ایک مضبوط دستہ اس محاصرہ پر چھوڑ کر باقی فوج آزدی کا پرچم لہراتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ حتیٰ کہ ان قلعہ کے پناہ گیروں کی سانسیں گھٹنے لگتیں وہ ان قلعوں کی دیواروں کو پھوڑ کر فتح کر لیتے۔

اس ذیل میں پہلی فتح کے موقعہ پر مشرقی فوج کابل کے ان بعض قلعوں کو بھی فوجی دستوں کے حوالہ کر کے آگے بڑھ گئی تھی جن کی دیواریں نا قابل فتح یا نا قابل شکست نظر آتی تھیں۔

زین العابدینؓ سے عرض کیا گیا: ''قلعوں کا محاصرہ کرنے والے فوجی دستوں اور اسلامی فوج کے لئے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب کرے۔'' ان کہنے والوں کی نظروں میں یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ دستے اور فوج، بنی امیہ کی حکومت کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن علی بن حسینؓ کی نظر میں یہ صرف اسلامی لشکر تھا۔ جس کی کامیاب قیادت کا سہرا بڑے بڑے صحابہ کی اولاد کے سر تھا۔ اس سلسلہ میں وہ اس قدر صاف دل تھے کہ اگر بالفرض یہ بنی امیہ ہی کی فوج ہوتی تو وہ اس وقت بھی اس کو رشک وحسد سے یاد نہ کرتے، کیونکہ بہرحال اس فوج کا مقصد اعلائے دین الٰہی تھا۔

زین العابدینؓ نے اس فوج اور محاصر دستوں کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا،

''اے اللہ ان کے ہتھیاروں کو تیز کردے۔ ان کی حفاظت فرما۔ ان کی طاقت نا قابل تسخیر کر، اس جماعت میں باہمی محبت دے اور تمام امور انجام بخیر کر۔۔۔

''اے پروردگار! نصرت وصبر کے ساتھ ان کے بازؤں میں طاقت دے اور اپنی بہترین تدبیریں ان کے شامل حال کر۔۔۔

''اے اللہ! دشمنوں سے مقابلہ کے وقت پر فریب دنیا کا تصور ان کے دماغوں سے نکال دے۔ پرفتن دولت کے وسوسے ان کے دلوں سے محو ہو جائیں۔ ان کی نظروں کے سامنے صرف جنت ہو۔ ان میں سے نہ کوئی راہ فرار سوچے اور نہ پیٹھ دکھانے کا ارادہ کرے!'' عرض کی گئی، ''زین العابدین دشمن کے لئے بھی شر وشکست میں مبتلا ہونے کی دعا کیجئے۔'' فرمایا:

''اے اللہ دشمنوں کا عروج خاک میں مل جائے وہ قلیل وذلیل ہو جائیں۔''

کسی نے عرض کی'' کیا آپ بنی امیہ کی فوج کے لئے دعا کر رہے ہیں؟'' فرمایا!

''اے اللہ! ان میں سے جو غازی بھی تیری ملت سے ہو اور سنت کی پیروی کرتا ہو تاکہ تیرا دین قوی اور تیری جماعت قوی ترین ہو تو اس کو آسانی اور تمام امور میں بھلائی نصیب کر، اس کو کامیاب کر، عافیت و سلامتی کے ساتھ واپس لا اور امن و عافیت کو اس کا ساتھی بنا!''

۹۴ھ شروع ہے، زین العابدینؒ ۵۸ سال کی عمر کے لگ بھگ ہیں، مشرق و مغرب سے اسلامی فوجوں کی فتح و کامرانی کی ہر تہنیت خوشخبری دم بدم پہنچ رہی ہے، ان بشارتوں میں یہ خوشخبری بھی ہے کہ پیچھے چھوڑے ہوئے قلعے بھی سلامتی کے ساتھ فتح ہو چکے ہیں۔ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ بعض قلعوں کی فتح کا سہرا چند قریب البلوغ عرب بچوں کے سر ہے۔ جنہوں نے قلعوں کی دیواروں پر چڑھ کر ان کے دروازے کھول ڈالے اور ساتھ ہی اپنی جان جان آفرین کو سپرد کر دی۔

امام سجاد کی زندگی کا چراغ ٹمٹما کر بجھا چاہتا ہے کہ قاصد نے آکر خبر دی! کابل کا آخری قلعہ بھی فتح ہو گیا'' زین العابدینؒ کے بجھے بجھے ہونٹوں پر حزن و مسرت میں ملی جلی کیفیت کے ساتھ مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ ان کو یاد آجاتا ہے کہ وہ ماں ''شہر بانو'' جس کو انہوں نے نہیں دیکھا وہ عرب و عجم میں تعلق کا سنگِ میل ثابت ہوئی۔

کابل کے آخری قلعہ کی فتح عرب و فارس کے باہمی ارتباط و تعلق کا اعلان تھا اور خدائے خیر و عدل، خدائے واحد جس نے تمام انسانوں کو مساوات کے ساتھ پیدا کیا تھا، وہ تمام انسانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر چکا تھا۔

☆☆☆

اسلام میں تصور مساوات

مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی

گذشتہ ربع صدی سے اسلام کے احیاء وارتقا کے لئے جو شخصیات تگ ودو کر رہی ہیں ان میں ایک نام علامہ قمر الزماں اعظمی مدظلہ کا ہے۔ بلاشبہ آپ خطیب الاسلام ہیں۔ امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل کا انہیں ادراک ہے۔ وہ خوب بولتے ہیں لیکن ان کے بولے ہوئے ہر لفظ کو میزان احتیاط میں تولا جا سکتا ہے۔ شاہد رضا نعیمی نے ان کی خطابت کے بارے میں واقعیت آشکار کی ہے کہ مولانا اتنے باوقار اور محتاط مقرر ہیں کہ انہیں اپنی کسی تقریر کے کسی جملہ یا لفظ سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تو آیئے دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ علامہ قمر الزماں اعظمی کیا فرماتے ہیں (دلیل راہ)

اللہ کے رسول تاجدار دو عالم، سرور کائنات، محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ سو اکہتر (571) سال کے بعد اس خاک دان گیتی پر اس دنیا میں ہوئی۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر سرور کائنات محمد رسول اللہ روحی فداہ ﷺ تک کا زمانہ یہ دنیا کا تاریک ترین زمانہ ہے۔ جسے "فترہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس وقفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس میں کوئی پیغمبر جلوہ گر نہیں ہوا، کوئی رسول نہیں آیا، کوئی نبی جلوہ گر نہیں ہوا، کوئی ہادی جلوہ گر نہیں ہوا حتیٰ کہ کوئی مجدد، دین کا بھی جلوہ گر نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کوئی مصلح جلوہ گر ہوا۔ یہ پانچ سو اکہتر سال کا زمانہ پوری دنیا کی تاریکی کا زمانہ ہے، سب سے زیادہ اندھیرا زمانہ ہے، ظلمتوں کا زمانہ ہے، ظلم کا زمانہ ہے، بدکرداری کا زمانہ ہے، خطاؤں کا زمانہ ہے، ناخدا پرستی کا زمانہ ہے، سجدوں کی آوارگی کا زمانہ ہے۔ وہ سجدے جو غیر اللہ کے لئے کئے جاتے ہیں۔ بندۂ مومن کا سجدہ کبھی آوارہ نہیں ہوتا، پیشانیوں کی رسوائی کا زمانہ ہے، عصمتوں کے نظام کے بکھر جانے کا زمانہ ہے، اور عفتوں کے نظام کے ٹوٹ جانے کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دنیا میں عدل کی ایک آواز بلند ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب دنیا میں ایک حکمران بھی نظر نہیں آتا جس نے عدل کی بساط بچھائی ہو اور انصاف کے بارے میں کوئی بات کہی ہو۔ یہ "571" سال کا زمانہ وہ ہے کہ جب پوری دنیا کسی ایسے نجات دہندہ کی منتظر تھی جو ایک قانون زندگی لے کر آئے، ایک دستور حیات لے کر آئے، اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کو منزل کا پتہ دے سکے۔

آیئے! تاریخ انسانی کے حوالے سے اور تاریخ کے ناقابل تردید شواہد کی روشنی میں دیکھیں کہ پیغمبر آخر الزماں سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی تک جو زمانہ گزرا ہے یہ کس اعتبار سے تاریخ کا تاریک ترین زمانہ ہے؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "دنیا تہذیب آشنا نہیں تھی، دنیا تمدن سے آشنا نہیں تھی۔ یونان تو موجود رہا ہوگا، چین تو موجود رہا ہوگا، جہاں تک تعلیم حاصل کرنے کا حکم خود پیغمبر اعظم نے دیا ہے۔ حکمت چین کی شہرت یقیناً تاریخ کا ایک حصہ ہے، ایران تو موجود رہا ہوگا، ایران میں اوستا کا نظام تو موجود رہا ہوگا، ایران کے آتش کدوں میں یقیناً اخلاق اور محبت کے کچھ شرارے اور کچھ چنگاریاں کہیں نہ کہیں موجود رہی ہوں گی۔ ہندوستان بھی موجود رہا ہوگا اور ویدک دور کے کچھ اخلاقی ضوابط یقیناً کسی گوشے میں پائے جاتے ہوں گے، اس کے باوجود یہ کہنا کہ تاریخ میں کہیں امن و انصاف اور تہذیب و شرافت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کیا یہ تاریخ کا کھلا مذاق نہیں ہے؟" یہ جتنے حوالے میں نے دیئے ہیں، یہ سب کے سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے حوالے ہیں۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام اور سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان میں پیغمبر تو پیغمبر ہیں کوئی فکری مصلح کنفیوشس کے نام سے، یا اوستا کے نام سے، یا ویدک کے نام سے کبھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ دور تاریخ کا انتہائی تاریک ترین دور ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جب ظلمتیں بڑھا دی گئی ہیں تاکہ اجالوں کا حقیقی احساس کیا جا سکے، جب ظلم چھا گیا ہے تاکہ عدل کا حقیقی تصور کیا جا سکے۔ "الاشیاء تعرف باضدادھا" "چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں" رات اندھیری کر دی گئی ہے تاکہ آفتاب تازہ کا جمال زیادہ دیکھا جا سکے۔ یہ وہ زمانہ دنیا کا بڑا تاریک زمانہ ہے۔ آپ کہتے ہیں یونان بڑا متمدن ملک تھا، یونان نے بڑے بڑے دانشور پیدا کیے تھے۔ مدون اخلاق پیدا کیے تھے۔ بڑا فرق ہے یونان کے تدوین اخلاق کا اور اس اخلاقی نظام کا جو مدینے کی گلیوں سے بپا ہوا تھا۔ یونان کا مدون اخلاق دنیا کو اخلاق کی تعلیم دیتا تھا مگر اس دعویٰ کے ساتھ کہ دنیا میں سب سے معزز قوم صرف یونانی ہے جسے حکومت کا حق ہے بلکہ دنیا کی تمام قومیں صرف غلامی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ آپ اندازہ فرمائیں گے جس نے طبقات کی بنیاد پر اخلاق کی بنیاد رکھی ہو، وہ اخلاق کی تعلیم کیا دے سکے گا؟ وہ تو انسانیت کی تذلیل کر رہا ہے، وہ تو انسانیت کو رسوا کر رہا ہے، وہ تو انسانیت کی توہین کر رہا ہے، وہ تو انسانیت کو قدموں کے نیچے روند رہا ہے، اخلاق کی تعلیم تو وہ پیغمبر اعظم دے گا کہ جس نے بتایا کہ آج کے بعد میں نے نسل و نسب کی تمام حیثیتوں کو اپنے قدموں کے نیچے روند دیا ہے، آج کے بعد شرافت اور تقویٰ کی بنیاد پر تمہیں منزل بھی ملے گی اور مقام بھی ملے گا۔ نسل و نسب سے مراد اس جاہلی نسل و نسب کی بات کر رہا ہوں جو عہد رسالت سے پہلے تھا اس بات کو ذہنوں میں رکھ لیجئے گا۔ اس لیے کہ کبھی کبھی جب معاملہ شعلہ زن ہوتا ہے تو لطیف باتیں بھی شعلوں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ میں ایسا کوئی ذہن آپ کو نہیں دینا چاہتا۔ میں عہد رسالت سے پہلے کے نسل و نسب کی بات کر رہا ہوں۔

اللہ کے رسول، تاجدار دو عالم، سرور کائنات، محمد رسول اللہ روحی فداہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام تک کوئی ایسا زمانہ آپ نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا معاشرہ نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسی سوسائٹی نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسی قوم نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا مصلح نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا ریفارمر نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا مفکر نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا ذہین انسان نہیں دکھا سکتے، کوئی ایسا حکمران نہیں دکھا سکتے، جس نے اپنے نظام کی بنیاد اخلاق اور عدل پر رکھی ہو، یہ زمانہ تاریک ترین زمانہ ہے۔ یونان کی بات کر رہے ہیں؟ یونان یقیناً کبھی دانشوروں کی آماجگاہ رہ چکا ہے مگر میرے آقا کی تشریف آوری سے پہلے ایک یونانی کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں کسی کمزور کو جینے کا حق نہیں ہے۔ یونان کے

معاشرہ کو طاقت کے قبضے کا معاشرہ کہا جاتا تھا۔ یونانی یہ کہتا تھا کہ دنیا میں کوئی کمزور جینے کا حق نہیں رکھتا ہے اور اس دعویٰ کو اور اپنے نظام کے اس حصے کو وہ اس حد تک اپناتا تھا کہ اگر کسی ماں کی آغوش میں کوئی طاقتور بچہ پیدا ہوتا تو ماں اسے زندہ رکھتی تھی اور اگر کوئی کمزور بچہ پیدا ہوتا تو ماں اپنے بچے کو لے کر پہاڑ کی چوٹی پر جا کر زمین پر گرا دیتی تھی اور خوش خوش چلی جاتی تھی کہ شاید اس نے کوئی انسانی فریضہ انجام دیا ہے۔ سرور کائنات ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یونان کی پہاڑیوں کی بلندیوں سے لاکھوں ننھے بچوں کو زمین پہ پٹخ کے موت سے ہمکنار کر دیا گیا ہو گا۔ اچھا تھا ہم اس دور میں موجود نہیں تھے مگر تصور کی آنکھ بڑی طاقتور ہوا کرتی ہے۔ خیال کی آگ بڑی طاقتور ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ موجود نہیں تھے تو تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کیجئے اور چشم تصور سے دیکھئے کہ یونان کے ایک متمدن شہر سے ایک ماں اپنے بچے کو کلیجے سے لگائے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پہ چڑھ رہی ہے اپنے دل کی دھڑکن کو سمیٹے ہوئے اور پہاڑ کی چوٹی پہ چڑھنے کے بعد اپنے ننھے سے بچے کو زمین پر پھینکتی ہے۔ بچہ خواہ کتنا ہی کمزور رہا ہو مگر زندگی کی معمولی سی رمق بھی رہی ہو گی تو اس بچے کی چیخ بلند ہوئی ہو گی۔ کوئی کرب ناک آواز بلند ہوئی ہو گی، جب بچے نے آخری ہچکی لی ہو گی، جب بھی کسی یونانی ماں نے یونان کی پہاڑی سے زمین پر کسی بچے کو پھینکا ہو گا اور بچہ بکھرا ہو گا تو اس کی روح تڑپی ہو گی، اس کی چیخ بلند ہوئی ہو گی، محمد رسول اللہ ﷺ اسی کمزور بچے کی چیخ کا جواب بن کر آئے ہیں۔ رحمۃ اللعالمین اسی کمزور بچے کی چیخ کا جواب بن کر آئے ہیں، اگر وہ نہ آئے ہوتے تو آج بھی یونان کی پہاڑیوں سے نامعلوم کتنے بچوں کو زمینوں پہ پھینکا جا رہا ہوتا۔ وہ تو رحمۃ اللعالمین تھے وہ تو کمزوروں کے لئے آئے تھے۔ وہ تو بے بسوں کے لئے آئے تھے۔ وہ تو بے سہارا افراد کے لئے آئے تھے۔ وہ تو طاقتور لوگوں کا معاشرہ نہیں کمزوروں کی سوسائٹی قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہ حکمرانوں کی نہیں بلکہ غلاموں کی آقائی کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے مزاج اقتدر بدل دیا تھا۔ پہلے اہل اقتدار قابض ہوا کرتے تھے اقتدار پر، مگر انہوں نے زمین سے اٹھایا تھا افراد کو، اور آسمان اقتدار کی بلندیوں پہ پہنچا دیا تھا اور پھر بھی کوئی نخوت اقتدار نہیں تھی۔ کوئی غرور اقتدار نہیں تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی تشریف آوری سے کچھ پہلے ایران میں نوشیروان عادل نام کا ایک انسان گزرا ہے۔ جس کے نام کا جز عادل تھا، میرے مرشد برحق آقائی و مولائی حضور مفتی اعظم ہند کے لب و لہجے میں بات کروں تو بات واضح ہو جائے گی کہ کسی بھی غیر مسلم کو لفظ عادل سے یاد کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ عدل و اسلام مترادف ہیں۔ جہاں اسلام نہ پایا جائے وہاں عدل نہیں پایا جا سکتا۔ اعتدال تو اسلام دیتا ہے، عدل کا تصور تو اسلام دیتا ہے۔ تاریخ نگاروں نے نوشیروان کے نام کا جز عادل بنا دیا ہے۔ کلیلہ ودمنہ کے مقدمہ نگار کے حوالے سے نوشیروان عادل کا ایک منظر دیکھیں وہ لکھتا ہے "کہ نوشیروان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ظلم کو عدل بنا کر پیش کرتا تھا اور لوگ اسے باور کر لیا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں ایک مرتبہ اس کے دربار میں موجود تھا اور اس نے اعلان کیا کہ اے لوگو! "میں نے زمینوں پر جو نیا ٹیکس نافذ کیا ہے وہ مبنی بر انصاف ہے یا نہیں ہے؟" تو تمام دبیران مملکت نے ایک آواز ہو کر کہا تھا حضور! حق وہ ہے جو آپ کی زبان سے نکلتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی قانون آپ پیش کریں اور مبنی بر انصاف نہ ہو؟ تو نوشیروان عادل نے ذہنوں کے چھپے ہوئے چور کا تجزیہ کرنے کے لئے کہا "میں تمہیں اب فکر کی آزادی دیتا ہوں اظہار کی آزادی دیتا ہوں، زبان کی آزادی دیتا ہوں freedom of expression کا دور ہے تم آزادی کے ساتھ بولو۔ یہ مت سمجھو کہ نوشیروان کے سامنے بول رہے ہو تم جو بھی کہو گے تمہارے قول کا احترام کیا جائے گا" لوگوں نے تھوڑی دیر بعد سوچا ہو گا کہ آج تو نوشیروان بدل گیا ہے۔ آج تو مزاج اقتدار میں بڑی (democracy) بڑی جمہوریت آ گئی ہے۔ آج تو وقت کا طاغوت انسانوں کی بولی بول رہا ہے۔ ایک شخص کو ہمت ہوئی اور اس نے کھڑے ہو کر کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ بات کہوں "آپ نے جو نیا قانون پیش کیا ہے یہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ نے غیر مستقل زمینوں پر مستقل ٹیکس لگائے ہیں۔ دریاؤں کے کنارے جو کٹاؤ کی زمینیں ہیں کسی وقت دریا کا بہاؤ انہیں نگل جائے گا اور غریبوں کی فریاد آپ کے دروازے پر اس وقت پہنچے گی جب زمین کا کوئی گوشہ ان کی لاش کو اپنے اندر سنبھال چکا ہو گا۔ اس لئے میرا یہ کہنا کہ جناب والا! مستقل زمینوں پہ مستقل ٹیکس لگائے جائیں اور غیر مستقل زمینوں پر غیر مستقل ٹیکس لگائے جائیں" یہ اس نے کہا۔ نوشیروان کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور اس کے بعد اس نے کہا "یہ کون ہے جو میرے دربار میں میرے قانون کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔" کچھ لوگوں نے ہمدردی کے لئے کھڑے ہو کر کہا "حضور یہ تبع مملکت ہے یہ آپ کے جملوں کو قانون کی شکل دے دیا کرتا ہے۔ جو بولتے ہیں اسے دستور بنا دیا کرتا ہے۔ بڑا نمک خوار ہے آپ کا اس کے اوپر احسان کر دیجئے، پہلی مرتبہ اس نے جرات بے جا کی ہے، پہلی مرتبہ غلطی کی ہے۔" اس نے کہا "یہ کون ہیں جو اس کے حمایتی ہیں۔ یہ سب کھڑے ہو جائیں اور ان کے سروں پہ لہو ہے کے قلمدان اس وقت تک توڑے جائیں جب تک ان کا بھیجا باہر نہ آ جائے۔" یہ وہ عدل تھا جس کو عادل کے نام سے یاد کیا گیا ہے مگر قربان جایئے کہ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ نے جو نظام عدل برپا کیا تھا اس کی عظمتوں کا یہ عالم کہ وہ عظیم فاتح جس نے قیصر و کسریٰ کی

قوتوں کو اپنے قدموں پہ جھکا دیا تھا جب وہی امام بن کر مسجد کے اندر کھڑا ہوتا ہے تو ایک معمولی سا انسان اعتراض کر دیتا ہے۔ ''عمر! یہ آپ نے جو چادر پہن رکھی ہے، یہ عمامہ جو سنوار رکھا ہے یہ اتنی بڑی اس چادر سے تو نہیں ہو سکتا جو آپ نے ہمیں تقسیم کی تھی کچھ آپ نے زیادہ لیا ہوگا بیت المال سے۔'' سیدنا عمر فاروق ؓ نے ارشاد فرمایا، عبداللہ بن عمر کھڑے ہوئے اور کہا ''میرے ابا کا قد عظیم یقیناً بہت زیادہ ہے۔ اس لیے میں نے اپنی چادر بھی ان کے حوالے کر دی ہے۔ انہوں نے میری چادر کو شامل کر لیا ہے۔'' ایک طرف وہ نوشیروان جو ایک مملکت کا حکمران ہے وہ یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے دربار میں کلمہ حق کہا جائے اور دوسری طرف نوشیروان کے جانشینوں کے اقتدار کو اپنے قدموں سے روندنے والے عمر یہ اجازت دیتے ہیں کہ دربار کا معمولی انسان بھی جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ یہ اسلام ہے جہاں اظہار کی آزادی ہے وہ قرآن جو اظہار کی آزادی دینے کے لئے آیا تھا، وہ قرآن جو مساوات کا تصور لے کر آیا تھا، وہ قرآن جو انصاف کا احساس لے کر آیا تھا، وہ قرآن جو تکمیل انسانیت کا نظام لے کر آیا تھا، وہ قرآن جو پستوں کو بلند کرنے کے لئے آیا تھا، وہ قرآن جو کمزوروں کو دعوت دینے کے لئے آیا تھا، وہ قرآن جس نے انسانوں کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا۔ آج اسی قرآن پر اعتراضات صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن سے بہت خوفزدہ ہیں۔ کبھی کبھی خوف کی آواز بھی بڑی ہی بھیانک اور ڈراؤنی ہو جایا کرتی ہے۔ کسی آبادی میں اگر خوف طاری ہو جائے تو رات بھر لوگ سوتے نہیں ہیں اور نئے نئے جھوٹے جھوٹے قصے سنایا کرتے ہیں کہ کل میں نے اس گلی میں اس کو دیکھا تھا اور ایک مسلح آدمی وہاں سے گزرا تھا۔ یہ سب خوف کی آواز ہے اور خوف کی آواز میں سچائی نہیں ہوتی۔ قرآن ایک غالب قوت بن کر اکیسویں صدی میں پوری دنیا پہ چھانے والا ہے اس لیے جو اس سے خوفزدہ ہیں اسے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ کا الزام لگانا چاہتے ہیں۔ قرآن سچائی ہے جو غالب ہو کے رہے گی۔ کم و بیش آدھی صدی سے زیادہ قرآن پاک کے نظام کو جبر و تشدد کے ذریعے دبانے کے باوجود جب تھوڑی سی آزادی ترکی میں انتخاب کی دی گئی ہے تو قرآن کے حاملین کی طاقت جیت گئی ہے، الجزائر میں دی گئی ہے تو وہاں جیت گئے ہیں وہ لوگ جو قرآن کے حاملین ہیں کیوں؟

روس میں ستر سال تک قرآن عظیم کا داخلہ ممنوع تھا۔ جو لوگ قرآن عظیم کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا غور سے سن لیں، توجہ دے دیں تھوڑی سی سچائیوں کو الزامات کے ذریعہ سے دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ اب تک مسلمان صرف تلاوت کرتا تھا۔ اب مسلمان نے قرآن سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ ستر سال تک یعنی لینن اور اسٹالین کے انقلاب کے بعد سے لے کر اب تک اگر قرآن پاک لے کر اگر کوئی پہنچ جاتا تو اسے سائبیریا کے برف زدہ علاقوں میں تڑپنے کے لئے ڈال دیا جاتا تھا۔ پوری پوری عمر کی قید دی جاتی تھی۔ قرآن پاک لوگ اپنی جان پر کھیل کر کہیں سے حاصل کیا کرتے تھے اور گھروں میں چھپ کے پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب کمیونزم کا نظام بکھرا تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن پاک کی درس گاہیں ان تمام خانقاہوں میں قائم ہو گئی ہیں جو آج تک محفوظ ہیں اور تنہا ورلڈ اسلامک مشن نے ایک ملین قرآن عظیم پانچ علاقوں میں تقسیم کیا ہے باضابطہ پانچ حکومتوں میں، ایک ملین سے مراد، دس لاکھ قرآن عظیم قرآن پاک ایک غالب قوت ہے، جتنا قرآن پاک کے نظام کو دبانے کی کوشش کی جائے گی اسی قدر یہ پھیلے گا۔

آپ اگر دیکھیں تو سرور کائنات ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا میں کہیں بھی انصاف کی کوئی آواز نہیں تھی آپ سوچتے ہوں گے مصر کی تہذیب بڑی پرانی ہے۔ مصر کی تہذیب نے اہرام تراشے ہیں، صنادید تراشے ہیں، بڑے طاقتور لوگ رہے ہوں گے۔ مگر مصر کی تہذیب کا تجزیہ کرنا ہو تو دیکھو کہ حضرت عمرو ابن عاص ؓ نے، جو مصر کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، جب شہر میں داخل ہوئے تو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک جلوس نکلا ہوا ہے، اس جلوس میں ایک بچے کو لوگ آراستہ کر کے کہیں لے جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا ''لوگو! یہ جلوس کہاں لے جا رہے ہو؟'' تو لوگوں نے کہا ''حضور! دریائے نیل خشک ہو گیا ہے اور جب نیل کا دیوتا اپنی زلفیں سمیٹ لیتا ہے تو ہماری کھیتیاں سوکھنے لگتی ہیں۔ اس لئے آج ہم دریائے نیل پر اپنے بچے کو قربان کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی زلفیں پھیلا دے اور ہماری کھیتیاں سیراب ہو جائیں''۔ سیلاب پوری دنیا میں تباہی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مگر عرب دنیا میں سیلاب نہ معلوم کتنی رحمتوں کا امین ہوتا ہے۔ اس لئے پوری دنیا میں اسے سیل آب وغیرہ کہتے ہیں۔ مگر عرب میں اسے فیضان کا نام دیا جاتا ہے، تو فیضان کے منتظر تھے وہ۔ حضرت عمرو ابن عاص ؓ نے سوچا اللہ اکبر! یہ لوگ اپنے بچے کو دریا پر بھینٹ کرنے جا رہے ہیں، ذبح کرنے جا رہے ہیں تاکہ دریا کی موجیں اس بچے کا خون پینے کے بعد خشک نہ ہو جائیں۔ کتنے ظالم ہیں یہ لوگ! آپ نے فرمایا ٹھہر جاؤ! ''جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا'' ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل مٹنے والا تھا۔'' انسان کائنات کا حکمران ہے، انسان اس زمین پر اللہ کے قوانین کا نافذ کرنے والا ہے، انسان کائنات کا سب سے حسین شاہکار ہے، انسان کائنات کا قاتل نہیں، انسان اللہ کی بارگاہ میں سر جھکانے کے بعد ساری کائنات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے انسان کائنات کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ''وسخر لکم الشمس

والقمر" تمھارے لئے زمین و آسمان کام میں لگا دیئے گئے ہیں۔"

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند

یہ سب کے سب انسانوں کے لئے لگائے گئے ہیں۔ اس لئے کوئی دریا ہو یا پہاڑ ہو، سورج ہو یا سیارہ ہو، آسمان کی قوت ہو یا زمین کی توانائی، مادی وقت ہو یا کہربائی قوت، شفاف قوت ہو، اقتدار یا خواہش ہو، نفع ہو یا نقصان، بلندی ہو یا پستی، کوئی بھی شئے انسان سے بندگی طلب نہیں کرسکتی، قربانی اگر دی جائے گی تو صرف اللہ کے لئے دی جائے گی، کسی کے حلقوم پر اگر چھری رکھی جائے تو بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر رکھی جائے گی اور انسان کے حلقوم پہ کوئی دوسرا نہیں وہ خود اپنی گردن کو اللہ کی راہ میں پیش کرسکتا ہے جسے حیات ابدی سے نواز جائے گا۔ مگر یہ بچہ نہیں اسے واپس لے جاؤ۔ میں کبھی اجازت نہیں دوں گا کہ ایک بچے کو دریا کی موجوں پر چڑھا دیا جائے۔ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے، اپنی کھیتی سیراب کرنے کے لئے، اپنی معاشی کفالت کے لئے، پتہ چلا بچوں کو روئی کی قربان گاہ پر صرف آج نہیں ہر دور میں چڑھایا گیا ہے، ہر زمانہ میں چڑھایا گیا ہے، انداز بدل گیا ہے، مزاج بدل گیا ہے، آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر نے بتا دیا کہ تمہارے شکم میں کوئی بچی ہے تو گروا دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بچی معیشت پر بوجھ ہوگی، بچی کے لئے جہیز فراہم کرنا پڑے گا، بچی کے لئے دوسری چیزیں فراہم کرنا پڑے گیں۔ کتنا ظالم ہے آج کا انسان؟ مگر وہی عہد جاہلیت کا زمانہ ہے جو لوٹ کر آ گیا ہے، اسے جاہلیت القرآن العشرین کے نام سے یاد کرسکتے ہیں۔ یہ بیسویں صدی کی جاہلیت ہے، یہ عصر کی تمدن کی جاہلیت ہے، یہ عصر حاضر کی جاہلیت ہے، جب اس زمانہ کا معاشی قربان گاہ پہ چڑھنے والا بچہ کسی نجات دہندہ کو پکارتا تھا تو آج بھی وہی نجات دہندہ دنیا کو سکون عطا فرما سکتا ہے، قرار عطا فرما سکتا ہے۔

جلوس تو واپس ہو گیا مگر سیدنا عمرو ابن عاص ؓ نے سوچا کہ اگر میں بچوں کی قربانی کی رسم کے بند کرنے کے بدلے انہیں پانی فراہم نہیں کیا تو یقیناً وہ کسی رات کی تنہائی میں یہ جرم کر بیٹھیں گے اور میرے آقا کا یہ حکم ہے کہ اگر دریائے نیل کے کنارے اگر کوئی بھوکا کتا بھی مر جائے تو عمر سے پوچھا جائے گا، انسانی ذبح تو بڑا دردناک معاملہ ہے اور اس کے بعد آپ نے حضرت عمر فاروق ؓ کو خط لکھا "اے امیر المومنین! یہاں لوگ اپنے بچوں کو دریاؤں پر چڑھا دیتے ہیں، اس لئے خدارا پانی کا انتظام کیجئے۔ کس یقین کی بنیاد پر یہ خط لکھا تھا؟ کس وسیلہ کی بنیاد پر یہ خط لکھا تھا؟ کیا وہ جانتے تھے کہ وہ پانی کا انتظام کرسکیں گے، صحرا میں؟ کیا جانتے تھے کہ پمپنگ سٹیشنوں کا نظام ہے؟ کوئی نہر جاری کردی جائے گی، کوئی میٹھا دریا جاری کردیا جائے گا۔ اس زمانے میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا مگر ایک بات پر یقین تھا کہ عمر فاروق ؓ نائب ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں مختار کل کے، اگر وہ چاہیں گے تو جہاں ٹھوکر لگا دیں گے زمزم پیدا ہوگا،

ایماں کے جہاں پڑتے ہیں قدم
پیدا وہیں زمزم ہوتا ہے

اس اعتماد سے یہ خط لکھا تھا اور سیدنا عمر فاروق ؓ نے جواب دیا تھا "اے دریا! اگر اللہ کے حکم سے جاری ہوتا تھا اور اللہ کے حکم سے رکتا تھا تو آج اللہ کا بندہ عمر کہہ رہا ہے۔ جاری ہو جا" اور دنیا نے دیکھا کہ جب دریا کی تہہ میں یہ رقعہ ڈالا گیا تو فیضان آیا اور کھیتیاں سیراب ہوتی چلی گئیں۔ " من کان للہ کان اللہ لہ" جو اللہ کا ہو جاتا ہے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے۔" اب آپ اندازہ فرمائیں کہ دریا کے کنارے جب کسی بچے کو ذبح کیا جاتا رہا ہوگا تو اس کی حلقوم سے نکلنے والا آخری قطرہ کسی نجات دہندہ کو پکارتا رہا ہوگا سرور کائنات ﷺ اسی مظلوم کے آخری قطرہ کا جواب بن کر آئے ہیں۔ رحمۃ اللعالمین کی تشریف آوری نہ ہوتی تو مصر کے دریاؤں کے کنارے آج بھی یہ انسانی ڈرامہ دیکھا جاسکتا اور یہ منظر مشاہدہ کیا جاسکتا! حضور سید عالم سرور کائنات ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا کی اور دوسری قوموں کا کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ کرنا ہو تو گرد و پیش کا مطالعہ بھی کرسکتے ہو اور جائز بھی لے سکتے ہو۔ یہ ساری ظلم کی رسمیں اگر بند ہوئی ہیں تو رحمۃ اللعالمین کی تشریف آوری کے بعد۔ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ آج کا دور غلاموں کی آزادی کا دور ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایک دن منایا جاتا ہے۔ آزادی freedom کا اور غلامی slavery کے ختم کرنے کا، جس روز انہوں نے غلامی کی رسم کو ختم کیا ہے وہ دن مناتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ غلامی کی رسم کو تم نے آج ختم کیا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ختم کیا ہے۔ مگر حضور رحمت عالم ﷺ نے غلاموں کو آقائی کا منصب آج سے چودہ سو سال پہلے عطا فرمایا تھا۔ تم نے تو بغاوت کے خوف سے ختم کیا ہے۔ جب یہ دیکھ لیا ہے کہ کالا افریقہ بیدار ہو کر گورے معاشرے کو نگل لینا چاہتا ہے۔ جب تم نے یہ دیکھ لیا کہ کالوں کی سرزمین کو اللہ نے معدنیات سے بھر دیا ہے اور گوروں کی زمین بنجر اور ویران ہوگئی ہے۔ تیل بھی ان کی زمین پر ہے، ہیرا بھی ان کی زمین پر ہے، معدنیات بھی ان کی زمین پر ہیں تو اس زمین کی لالچ میں آج تم غلاموں کو آزاد کرنے کی بات کر رہے ہو، لیکن اگر تم نے روٹس کا مطالعہ کیا ہوگا یہ بھی ماضی قریب کی ایک کتاب ہے جس میں ایک غلام نسل کا انسان

امریکہ سے اپنی جڑیں ڈھونڈنے کے لیے افریقہ جاتا ہے اور اس کے بعد اس نے غلاموں کے سفر کا جو منظر کھینچا ہے تو اسے دیکھو آنکھوں میں آنسو آجائیں گے، دل کانپ جائے گا۔ کشتیوں میں لاد کر غلاموں کو لایا جاتا تھا اور ان کو زخم لگائے جاتے تھے اور ان کو مارا جاتا تھا اور اگر خدانخواستہ کبھی ان کے زخم بڑھ جاتے تو ان زخموں پہ پانی ڈالا جاتا تھا، ان زخموں پہ نمک چھڑکا جاتا تھا اس طرح سے انہیں موت سے ہمکنار کیا جاتا تھا۔ ابھی تک غلامی کی یہ رسم رہی ہے، مگر لوگوں نے جب دیکھا کہ غلامی کے خلاف دنیا میں آواز بلند ہو رہی ہے تو خود ہی غلامی کو ختم کرنے کی بات کر کے آج غلامی کے ختم کرنے کا انعام اپنے سر لینا چاہتے ہیں، مگر انہیں معلوم نہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے سرور کائنات محمد رسول اللہ روحی فداہ ﷺ نے عملاً غلامی کو ختم فرما دیا تھا۔ ہر اس انسان کو جو غلاموں سے محبت کر رہا ہو جنت کی بشارت دی تھی۔ کسی گناہ کے بدلے میں غلام آزاد کر دیا جائے تو مغفرت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ روزہ چھوڑ دو غلام آزاد کر دو تو بخش دیے جاؤ گے۔ کوئی غلطی کر لی ہو تو غلام آزاد کر دو تو بخش دیے جاؤ گے۔ کوئی خطا کر بیٹھو غلام کو آزاد کر دو تو بخش دیے جاؤ گے۔ تاریخ انسانی میں کیا کوئی ایسا حکمران ملے گا کہ جس نے غلاموں کو آزاد کرنے کے بعد اپنے گھر کا فرد بنا لیا ہو، کیا حضرت زید محمد رسول اللہ ﷺ کے گھر کے فرد نہیں ہو گئے تھے۔ کیا بلال حبشی ؓ جن کو ان کے آقا سے سیدنا صدیق اکبر ؓ نے آزاد کروایا تھا اور پھر یہ کہتے تھے "سیدنا بلال" "بلال ہمارے سردار ہیں۔ دیکھو دنیا کا قانون یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی بات، نیا انعام، نیا فیصلہ کسی کو ملتا ہے، تو جب سب سے پہلے جو بنیاد رکھتا ہے اس کا احترام کیا جاتا ہے، اسے مانا جاتا ہے، اسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ میرے آقا ﷺ سے پہلے اگر کسی نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بات کی ہو تو تم کریڈٹ اسے دے سکتے ہو لیکن میرے آقا ﷺ سے پہلے دنیا میں کسی نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بات نہیں کی ہے۔ تو آج دنیا میں جو بھی غلام آزاد ہو گا یہ صدقہ ہو گا رسول اللہ ﷺ کا۔ یہ صدقہ ہو گا سرور کائنات ﷺ کا، میرے آقا ﷺ سے پہلے اگر کسی نے مساوات کی بات کی ہو تو تاریخ کا حوالہ دکھاؤ۔ کسی مذہب نے بات کی ہو، کسی دھرم نے بات کی ہو کہ انسان برابر ہے۔

انسان سب ایک جیسے ہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ "کلکم من آدم و آدم من تراب" "تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا"۔ میرے آقا ﷺ سے پہلے کسی اور نے یہ بات کی ہے کہ تم سب ایک باپ کے بیٹے ہو؟ ایک باپ کے بیٹے ہونے کا مطلب سمجھتے ہو؟ تم سب بھائی بھائی ہو، کسی بھی قوم سے تعلق ہو تمہارا، کسی بھی خاندان سے تعلق ہو تمہارا، کسی بھی علاقے سے تعلق ہو تمہارا، ایک نن (راہبہ) نے مجھ سے یہ پوچھا تھا، "اسلام اتنی سختیاں کیوں کرتا ہے؟ اپنی بچیوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ ملنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا، اس قدر پابندی کیوں لگائی جاتی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر" میں نے کہا کہ "تم بھی یہ پابندیاں لگاتی ہو مگر تھوڑے فرق کے ساتھ، تمہارے یہاں شاہی خاندان کی کوئی بچی عام انسانوں سے مل لیتی ہے تو اتنا ہنگامہ کیوں مچا لیتے ہو تم؟ تمہارے یہاں شاہی خاندان کے بیٹے عام انسانوں سے کیوں نہیں ملتے؟" تم نے جو احترام اپنے بادشاہوں کو دے رکھا ہے رسول اللہ نے وہ احترام اپنے ہر امتی کو دے رکھا ہے، اپنے ہر غلام کو دے رکھا ہے، تم نے اپنی عزت کا تصور محدود کر رکھا ہے چند خاندانوں میں مگر ہمارے لئے اسلام میں سب کے سب برابر ہیں، پھر تم یہ نہیں جانتے ہو کہ اسلام کسی ایسے رشتے کا قائل نہیں ہے جس کی بنیادیں فراہم نہ کی جا سکیں، اسلام میں تمام انسان ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے سب بھائی بھائی ہیں، بھائی اور بہن ہیں، اس لئے کہ جب تک کوئی لڑکی کسی کے نکاح میں نہ آجائے اس سے پہلے اگر کوئی لڑکی ہو گی تو وہ بہن کہلائے گی اس کے سوا کچھ نہیں کہلائے گی۔ اسلام یہ نظریہ دیتا ہے اپنے بیٹوں کو کہہ دینا کہ ہر بچی کی خواہ وہ کسی ہندو گھر میں پیدا ہوئی ہو، عیسائی گھر میں پیدا ہوئی ہو، مسلمان گھر میں پیدا ہوئی ہو اسے بہن کی نظر سے دیکھو اس لئے کہ وہ حوا کی بیٹی ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اور ہر بوڑھے انسان کو باپ کی نظر سے دیکھو اس لئے کہ وہ بھی آدم کا بیٹا ہے جو تم سے عمر میں بڑا ہے وہ تمہارے باپ کی طرح سے ہے۔" اسلام دراصل محبتوں کے وہ لافانی رشتے قائم کرتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ چیلنج کر سکتی ہے، نہ مٹا سکتی ہے۔ شادی سے پہلے کسی جنسی رشتے کا اسلام اس لئے مخالف ہے کہ نہ معلوم کتنے بچے بیچارگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں، وہ اپنی پہچان کھو بیٹھتے ہیں، یورپ لرز رہا ہے، امریکہ کانپ رہا ہے، ان کروڑوں بچوں کے باپ کو تلاش کرنے کے سلسلہ میں جو اپنے باپ کا نام نہیں بتا سکتے ہیں۔ چند لمحوں کی لذت صدیوں کی لذتوں کا پتہ ان کی گرونوں میں ڈال دیتی ہے۔ اس لیے اسلام نے منع کیا ہے کہ شادی سے پہلے کوئی تعلق قائم نہ کیا جائے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ بے پہچان بچے سامنے آجائیں، بے نام بچے سامنے آجائیں، شناخت کے بغیر بچے سامنے آجائیں، معاشرے پر بوجھ بن جائیں، تہذیب پہ بوجھ بن جائیں، تمدن پہ بوجھ بن جائیں، اس لئے ایسے ہر دروازے کو بند کیا گیا ہے جہاں سے یہ جنسی انارکی پھیل سکتی ہو۔ جب میں نے یہ بات کہیں تھی تو بوڑھی نن نے کھڑے ہو کر کہا تھا "میں آج بھی مسلمان ہو سکتی ہوں؟" میں نے کہا "اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو سرکار نے تمہیں دوہرا انعام دینے کا فیصلہ دیا ہے۔ تم اپنے دور

میں جو نیکیاں کر سکی ہو وہ بھی ملیں گی اور آج کے بعد اتنی نیک بن جاؤ گی جیسے ماں کے شکم سے پیدا ہوئی ہو۔"

انسانی مساوات کا جو تصور ہے یہ سرورِ کائنات ﷺ کی عطا ہے، میرے آقا سے پہلے کسی مذہب نے دیا ہو تو بتاؤ! بلاشبہ توریت اللہ کی کتاب تھی، مگر وہ توریت جو آج یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کافی بدل دیا گیا ہے۔ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ شرافت تو محدود ہے اسرائیل کے اندر، غیر اسرائیل کبھی شریف ہو ہی نہیں سکتا ہے، بلاشبہ انجیل اللہ کی کتاب تھی۔ لیکن بدلی ہوئی انجیل میں انسانیت کا اتنا لرزہ خیز تصور پیش کیا گیا ہے کہ آپ سنو گے تو کانپ جاؤ گے، بدلی ہوئی انجیل میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہگار ہے۔ جب وہ پیدا ہوا ہے تو گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوا ہے۔ یہ اسلام ہے جو کہتا ہے کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ ماں باپ کے شکم سے بے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ بے خطا پیدا ہوتا ہے اور جب تک شعور کی بنیاد پر گناہ کے قابل نہ ہو جائے اسے بے گناہ اور بے خطا ہی سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم سے گناہ ہوا تھا اس لئے بیٹے نے گناہ کو ورثہ میں لے لیا ہے۔ وہ گنہگار پیدا ہوا ہے۔ معاذ اللہ! اول تو ہم حضرت آدم علیہ السلام کے اقدام پیغمبرانہ کو گناہ کہنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ نبی معصوم ہوا کرتا ہے اور تم نے دنیا میں دیکھا ہوگا کہ گناہوں کے بدلے میں ویرانیاں ہوتی ہیں، گناہوں کے بدلے میں بربادیاں ہوتی ہیں، گناہوں کے بدلے میں زمین اجڑ جاتی ہے، گناہوں کے انجام کے طور پر گھر ختم ہو جاتے ہیں، نسلیں برباد ہو جاتی ہیں مگر یہ کیسا گناہ ہے حضرت آدم علیہ السلام کا کہ:

ہم ہوئے کہ تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اگر وہ نہ ہوتے تو آج نہ ہم ہوتے، نہ تم ہوتے، ترقیوں کی انجمن ہوتی اور نہ یہ کائنات کی آبادی ہوتی۔ مصلحت خداوندی کو گناہ کا نام نہ دو لیکن اگر تم نے گناہ کہہ دیا ہے تو یہ ظلم کیا ہے تم نے جناب آدم کے مقدس نام کے ساتھ، مگر یہ ظلم اپنی اولاد پر منتقل تو نہ کرو، پیدا ہونے والا بے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر بچپن میں مر جائے تو جنتی ہوتا ہے۔ ماں باپ کو بھی جنت میں لے جانے والا ہوتا ہے۔

یہ تصور انسانیت اور عظمت انسانیت کا تصور کس نے دیا ہے؟ اب ایک طرف تو یہ کہا گیا اور پھر یہ کہا گیا۔ اچھا! گناہگار تو پیدا ہوا ہے، مگر ایک دفعہ زندگی میں وہ اعتراف گناہ کر لے تو گناہ معاف ہو جاتا ہے اور اعتراف گناہ کا ڈھنگ کیا ہے، کسی پادری کے پاس، کسی چرچ کے رہنما کے پاس جا کر اپنی زندگی کا کچا چٹھا بیان کیا جائے۔ اسے اعتراف گناہ کہتے ہیں اور اس کے بعد وہ خدا اور بندے کے درمیان میں ذریعہ بن جائے تو گناہ معاف ہوتا ہے۔ اسلام نے اس تصور کو روند ڈالا ہے۔ اسلام کسی انسان کو انسان کے سامنے ذلیل ہونے سے بچاتا ہے۔ چرچ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ رومن دور میں نہ معلوم کتنے شہزادوں کو اور شہزادیوں کو ان کے گناہوں کی بنیاد پر چرچ بلیک میل کرتا رہا، انھیں سزائیں دیتا رہا، مگر اسلام میں اگر کسی سے غلطی ہو جائے۔ آدم نے غلطی نہیں کی تھی۔ گناہ نہیں کیا تھا اور ان کا بیٹا بھی گنہگار نہیں ہے، لیکن اگر بعد میں کسی سے گناہ ہو جائے تو اس کے لیے کسی پادری کے پاس نہیں جانا ہے۔ کسی مولوی کے پاس نہیں جانا ہے، اپنے گناہ کا اعتراف کرنے کے لیے کہیں نہیں جانا ہے۔ رات کی تنہائی میں جب پوری دنیا سو رہی ہو چند آنسو اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دیے جائیں، گناہ خود بخود معاف ہو جائیں گے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اپنے عقیدوں کے بھیانک گوشوں کو چھپا کر آج یہ قوم بھی نئے لائچ کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آ رہی ہے۔ ہمارا مذہب اچھا ہے۔ ہمارا دین اچھا ہے۔ نہیں! مطالعہ کرو اور اسلام اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا ہے اور اپنی پوری قوت کے ساتھ دنیا کے پورے علاقوں میں پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ تم مایوسیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو۔ نکل آؤ اس دلدل سے غربت اپنے مقام پر ہے، پریشانیاں اپنے مقام پر ہیں، مگر اسلام کمزور نہیں، اسلامی تہذیب کمزور نہیں کہ شکست کھا جائے، اسلام غالب ہونے کے لیے ہے، مسلمان بلند ہونے کے لیے ہے۔

کبھی کبھی مایوسی موت بن جایا کرتی ہے، نکال دو اپنے ذہنوں سے مایوسی کا کوئی تصور۔ اب تک ہم ان پڑھ تھے۔ اپنی خوبیوں سے خود واقف نہیں تھے۔ اسلام کی عظمتوں سے آشنا نہیں تھے اس لیے مایوسیاں ہمارے دروازوں پر ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں، مگر اسلام ایک غالب قوت بن کر ابھر رہا ہے اور دنیا میں جو بھی اسلام کے خلاف بولا جا رہا ہے وہ دراصل وہ ان کا اپنے اندر کا خوف ہے جو بول رہا ہے، وہ اسلام کا دروازہ روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے مگر جب ہوا تیز ہوتی ہے تو رفتار بڑھانی پڑتی ہے۔ ہمیں اپنی رفتار بڑھانی ہوگی، ہمیں درسگاہیں قائم کرنی ہوں گی، ہمیں ادارے قائم کرنے ہوں گے، ہمیں مدارس قائم کرنے ہوں گے جہاں ہم اپنے بچوں کو اسلام کی خوبیاں بتا

سکیں۔ اسلام کی عظمتوں سے آشنا کر سکیں کہ تمہیں خیر امت کے منصب سے نوازا گیا ہے اور تم صرف اپنے نہیں پوری دنیا کے نجات دہندہ ہو۔

آج دنیا میں حقوق نسواں کی بات کی جا رہی ہے۔ عورتوں کے حقوق کی اور معاذ اللہ! قرآن پاک کے مفہوم کو غلط سلط پیش کر کے قرآن پاک کو عورتوں کے حقوق کا غاصب کہا جا رہا ہے۔ ذرا سوچو اور غور کرو۔ میرے آقا حضور سید عالم سرور کائنات ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اگر دنیا میں کسی بھی ریفارمر یا مصلح نے عورتوں کے حقوق کی بات کی ہو تو دکھاؤ، ایک واقعہ دکھا دو، عورتیں بیچی جاتی تھیں، خریدی جاتی تھیں، جائیداد میں تقسیم ہوتی تھیں، کنیزیں بنائی جاتی تھیں، عورتوں کی قربانی دی جاتی تھیں، ذبح کر دی جاتی تھیں، پیدا ہوتے ہی دفن کر دی جاتی تھیں۔ "واذا الموء دۃ سئلت، بای ذنب قتلت" آج کے دور کو تم سب سے ترقی یافتہ دور کہہ رہے ہو، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے عورتیں بکتی تھیں اور آج عورتیں اتنی ذلیل ہو گئی ہیں۔ خود نہیں بکتی ہیں بلکہ سامان تجارت کے بیچنے کا ذریعہ بن رہی ہیں، جتنی بھی Modeling ہو رہی ہے عورتوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے، اب عورت نہیں بک رہی ہے، عورت کا شباب چادر بیچ رہا ہے، کپڑے بیچ رہا ہے، روٹی بیچ رہا ہے، چائے بیچ رہا ہے، بسکٹ بیچ رہا ہے، عورت کا شباب بک رہا ہے، عورتوں کی جوانی بک رہی ہے۔ کس قدر رسوا کر دیا گیا ہے مغربی ماحول میں، آج ہوٹلوں میں عورتیں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، پرسنل سیکرٹری عورتیں ہیں، جہازوں میں باضابطہ عورتیں غیر مردوں کے سامنے جھک جھک کر اپنی حیاء اور غیرت کو نیلام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایئر ہوسٹس کے ذریعہ سے فضا میں عورت بک رہی ہے۔ قحبہ خانوں میں عورت بک رہی ہے۔ پہلے عورت بیچی جاتی تھی۔ آج سامان تجارت کے ساتھ عورت بک رہی ہے۔ پہلے بھی بک رہی تھی آج بھی بک رہی ہے۔ اگر آج کی عورت کے اندر ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو عصر جدید کی تہذیب کے خلاف چیلنج کرتی کہ ہمارے عریاں جسموں کو دکھا کر تم اپنا سامان بیچ رہے ہو۔ کیا ہم اتنی ذلیل ہو گئی ہیں؟ ہم اتنی رسوا ہو گئی ہیں؟ وہ اسلام ہے عورت کو اپنی زندگی کی قیمتی متاع سمجھتے ہوئے پردے میں رکھتا ہے اور دنیا میں ہر رسوائی کے بازار سے بچا لیتا ہے۔ اسلام نے عورت کو بکنے کی چیز نہیں بنایا ہے۔ وہ کسی اسٹیج پہ نہیں بکتی، تم اسے دوسروں کی نگاہوں کا تماشا بنانے کے لیے اسے ننگا کر کے پردہ سیمیں پر لائے ہو، تم اسے سینما کے پردے پہ لائے ہو، یہ غیرت ہے اس کی، تم نے اسے ذلیل کر دیا ہے اور رسوا کر دیا ہے، آج اس کے اندر اگر احساس بیدار ہو جائے تو مغربی تہذیب کے خلاف سب سے بلند آواز عورتوں کی طرف سے بلند ہوگی۔ سب سے قد آور آواز عورتوں کی طرف سے اٹھے گی کہ ہمیں صدیوں سے ذلیل کیا گیا اور رسوا کیا گیا ہے۔

اسلام میں عورت کا تصور کتنا محترم ہے کہ اسلام میں عورت ماں ہے، جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے "الجنۃ تحت اقدام الامھات" "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔" مرد اگر اپنی جنت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اپنی ماں کے قدموں کے نیچے تلاش کرے گا۔ اسلام میں عورت بہن ہے، جس کی ایک آواز پر خواہ وہ اپنی بہن نہ ہو یقین مان لو کہ نجات کے قافلے ہزاروں مقامات کا سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلام میں عورت بیٹی ہے، جس کی غیرت کا تحفظ پورے معاشرے کا فرض ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں عورت کچھ بھی نہیں ہے۔ بیوی ہے جو شریک حیات ہے، ذریعہ سکون ہے۔ "لتسکنو الیھا" کی علامت ہے، دبستان حیات کا شگفتہ پھول ہے اور زندگی کی بہترین شریک کار ہے۔ اس کے سوا عورت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اسلام میں عورتوں کو ذلیل کرنے والے، اپنی بیٹیوں کو بازار میں نیلام کرنے والے، اپنی بچیوں کو رسوا کرنے والے اور ماڈلنگ پر مجبور کرنے والے اور عریاں ہو کر سامان فروخت کرنے پر مجبور کرنے والے، جہازوں میں شرابی اور زنا کار اور اجنبی مسافروں کے سامنے ان کی مسکراہٹیں پیش کرنے والے یہ اس قابل ہیں کہ عورت کی عزت کی بات کریں؟ یہ اس قابل ہیں؟ کہ عورت کی ناموس کی بات کریں؟ آج کے دور کے یہ ظالم اس قابل ہیں کہ عورت کی آبرو کی بات کریں؟ عورت اگر محفوظ ہے تو مذہب کے دامن میں محفوظ ہے۔ اسلام کے دامن میں محفوظ ہے۔ اس کے سوا عورت کی حفاظت کی ضمانت نہ دنیا کی کوئی طاقت دے سکتی ہے نہ کوئی سوسائٹی دے سکتی ہے۔

اس کا مطالعہ کرو۔ درسگاہیں قائم کرو اور سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے نظام رحمت کو اپنے سینوں میں اتاروں یہ اسی وقت ہوگا جب رسول اللہ ﷺ کی اتباع تمہاری زندگی کا حاصل بن جائے گی۔ اس وقت اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا اور جب تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں شکست نہ دے سکیں گی۔ "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" "رسول کی اتباع کرو محبت الٰہی کا وہ مقام حاصل کرلو کہ جہاں بھی تمہاری کسی شوکت کو چیلنج کیا جائے اللہ کا کرم تمہارے ساتھ ہو جائے۔"

☆☆☆

خوش نصیب ہے کہ تیری آنکھ نم تو ہے

حافظ شیخ محمد قاسم

بیتے ہوئے واقعات قلم بند کرنا تاریخی امانت ہوتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ ماضی میں شاہوں بادشاہوں ہی کو یہ رتبہ دیا جاتا کہ ان کی چھینکیں بھی قرطاس وقلم کے حوالے کی جاتیں۔ تیموری، بابری اور جہانگیری توزک دلچسپ یادداشتوں کے دفینے یا گنجینے ہیں۔ جدید دنیا نے اب یہ بات فوق الجث بنادی ہے کہ علماء اور فقرا بادشاہوں سے زیادہ جہان مادہ ومعنی میں اثر چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سکندر ودارا صرف نام رہ گئے ہیں لیکن رازی وروی، جامی وغزالی اور طوسی وابن خلدون تابندہ حقیقتیں ہیں جو آسمان رفعت پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ ہمارے شاہ جی کو اکثر عوامی حلقوں میں بادشاہ اور شہنشاہ کہہ دیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ وہ ہر طرح انکار ومنع کا وظیفہ جاری رکھتے ہیں لیکن عقیدت مندوں کے جذبوں کا سیلاب تھمتا ہی نہیں۔ لوگوں میں آپ کی مقبولیت آپ کے نزدیک اللہ کا فضل ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس علم تسخیر ہے لیکن شاہ جی وظائف اوراوراد کی دنیا کے آدمی نہیں، آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے قلبی روحانی اور وجدانی محبت اور اس سے مانگتے رہنا ہی سرمایہ حیات ہے۔ دعا سے آپ ہمیشہ مدد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ ہنس مکھ، شگفتہ مزاج اور زعفران طبیعت شاہ جی جب دعا کررہے ہوں، لگتا ہے کسی نے انہیں ٹکٹکی پہ چڑھا دیا ہے۔ احتیاط کا عالم یہ ہوتا ہے کہ سینکڑوں لوگ آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں لیکن آپ ہر ایک کی التجا کو امانت سمجھ کر خلوتوں میں اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ آپ دعا ریاضی کے سوالوں کی طرح نہیں کرتے بلکہ ایک خاص داخلی کیفیت میں ڈوب کر نشان بندگی بن جاتے ہیں۔ بھائی بہاؤالدین جب رات کو ڈائری لے کر شاہ جی کے حضور پیش ہوتے ہیں منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ ایک ایک ساتھی کا نام لے کر بہاؤالدین بھائی لوگوں کی پریشانیوں کا ذکر کررہے ہوتے ہیں اور شاہ جی ہر ایک کے لیے دعا اور ہر ایک کی دعا پر آمین کہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ معلوم ہوا کہ دعاؤں کے پیریڈ میں بھائی بہاؤالدین نے ایک ساتھی کا مسئلہ پیش کردیا کہ نماز کے بعد اتفاق مسجد کے باہر سے ان کی سائیکل گم ہوگئی ہے اور وہ دعا کے لیے درخواست کررہے تھے۔ شاہ جی نے امر فرمایا کہ اسے سائیکل لے کردے دو اور قیمت مجھ سے وصول کرلو۔ یہ کہا اور بہاؤالدین کو رخصت کردیا۔ عثمان ندیم کمرے میں داخل ہوئے تو آپ نے فرمایا "اللہ سائیکل والے کا بھلا کردے میری نماز اور ذکر دونوں لذیذ ہوگئے ہیں!" پھر دیر تک آپ روتے رہے۔۔۔

شبنم تجھے اجازت اظہار غم تو ہے
تو خوش نصیب ہے کہ تیری آنکھ نم تو ہے

بات دعاؤں کی چل نکلی تو عرض کرتا چلوں عیدالفطر کے فوراً بعد کی بات ہے شاہ جی نے میری کنیا کو زینت بخشی اور کچھ دیر حسن ریاض کے ساتھ دل لگی، پیار اور روح بخشی میں مشغول رہے اور فرمایا مجھے اوگی جانا ہے۔ شاہ جی اپنے شیخ محترم کے مزار پر حاضری اکثر اسی طرح دفعتاً دیتے ہیں۔ میں افسردہ سا ہوگیا کہ دل شوریدہ اس بار معیت اور ہمرکابی کا شرف نہیں پاسکے گا۔ پیٹ کا آپریشن پہلے ہی تکلیف دہ بنا ہوا تھا اب کی بار شاہ جی کا فراق بڑا ہی گراں بار ثابت ہوا اور میں ہر گھنٹہ بعد حفیظ بھائی عثمان ندیم یا پھر یاسر فاروق کے ذریعے شاہ جی کے ساتھ تخیلاتی سفر میں شریک ہوگیا۔ بھائی یاسر بتاتے ہیں کہ ہری پور سے حافظ محمد زبیر چند ساتھیوں کے ساتھ عازم اوگی ہوئے۔ ایبٹ آباد سے علامہ بشیر القادری، ڈاکٹر سلیم خان، محمد حنیف عباسی اور ایک سید صاحب شریک سفر ہوئے۔ یہ تمام دوست ایک گاڑی کے ذریعے شاہ جی کے قافلے میں شامل ہوگئے۔ مانکل پہنچے تو ایک ساتھی نے انتہائی کربناک لہجے میں دعا کی درخواست کی کہ اس کی بیٹی گم ہوگئی ہے اس لیے اسے فوراً گھر لوٹ کر جانا ہے۔ وہ ساتھی خود واپس چلا گیا اور پورا قافلہ غم، کرب اور پریشانی کا شکار ہوگیا۔ خصوصاً شاہ جی کی حالت دیدنی تھی آپ بار بار پانی پیئے جارہے تھے، روئے جارہے تھے اور کبھی کبھی بشیر القادری کے ذریعے استفسار کرتے کہ بچی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے؟۔ اوگی پہنچے، نماز پڑھی، مزار پاک پر حاضری ہوئی بعد ازاں حضرت لالہ جی کے آستان اقدس پر محفل ذکر ہوئی اور دعا میں شاہ جی کی زبان سے یہ الفاظ سنے گئے کہ "اللہ یہ شخص تو تیری رضا کے لیے درویشوں کے قافلے میں شریک ہوا اس کی جواں سال بیٹی آج ہی گم ہوگئی، اس آدمی کے دین کا کیا بنے گا۔ اے اللہ اس کی بیٹی واپس کردے ورنہ بندہ کیا کرسکتا ہے۔ عاجز اور بے بس سے کیا ہوسکتا ہے۔ میرے مولا میرے کریم اگر تو نے مہربانی نہ فرمائی تو تیرا یہ عاجز بندہ پیری مریدی کو خیرآباد کہہ دے گا۔ میرے مولا ندامت سے بچانا" آپ نے تین مرتبہ فرمایا:

کرم کرم کرم

یارب یارب یارب

اوگی شریف سے واپسی ہوئی تو راستے ہی میں بشیر القادری فرمانے لگے کہ لڑکی والے ساتھی کا فون آیا ہے کہ بچی واپس آگئی ہے شاہ جی کو بتادینا کہ غمگین نہ ہوں۔ بس آپ نے اتنا ہی فرمایا:

یارب تیرا شکر
فقیر بے نوا کی دعا کو تو نے
شرف قبولیت بخش دیا۔

اس کے بعد مانسہرہ تک آپ مسلسل خاموشی سے درود شریف کی منزل پڑھتے رہے۔

راستے میں کہیں چائے نوشی کا دور چلا تو شاہ جی نے فون پر میرا حال دریافت کیا۔ مجھے آپ کی طبیعت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا لیکن آپ کی باتوں سے بھانپ گیا کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے کہ مزاج مبارک میں شگفتگی رونما ہو چکی ہے۔ فرمانے لگے تیری بیماری نے مجھے اپنی اصل سے ہٹا دیا ہے۔ آج ایک دعا کی اور مقام نیاز سے ہبوط ہو گیا۔ بڑی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ وہ لوگ جو حضرت جنید بغدادی کے مشرب کو سمجھتے ہیں ان کی زندگی میں آٹھ باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ ہم لوگ چونکہ شجرہ کی ایک نسبت سے حضرت جنید کے بھی نوکر ہیں اس لیے طریقت میں ان کے راہنما اصول ہمارے لیے بھی باعث رحمت ہیں۔ آج مجھ سے ایک غلطی ہو گئی اللہ معاف فرما دے۔ غالباً اشارہ ترک شکوہ کی طرف تھا۔ اس لیے کہ حضرت جنید کے نزدیک صحت سلوک کی شرائط یہی آٹھ چیزیں ہیں۔

(۱) ہمیشہ طہارت کی حالت میں رہنا
(۲) دوام صوم
(۳) دوام سکوت
(۴) خلوت نشینی اور کامل انقطاع
(۵) ذکر الٰہی پر دوام
(۶) دوام نفی خواطر
(۷) شیخ کے ساتھ قلبی رابطہ پر دوام
(۸) ترک شکوہ فائدہ ہو یا نقصان

شروع سے شاہ جی کا معمول ہے کہ بارگاہ شیخ سے جب واپسی ہو تو ایک آدھ ساتھی کو بلا کر آپ از راہ شفقت راز نوازی کا تحفہ عطا فرماتے ہیں۔ اس بار واپسی ہوئی تو شاہ جی میری اہلیہ کے والد گرامی سے ملنے گھر تشریف لائے، چونکہ وہ سارے لوگ ہی شاہ جی کے ساتھ روحانی وابستگی رکھتے ہیں تو آج باب رحمت میرے گھر ہی میں کھلا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ عام طور پر شاہ جی روحانی باتیں مجھ سے کم ہی کرتے ہیں لیکن آج اوگی کا واقعہ خود سنایا اور ساتھ مزید شفقت فرمائی اور ایک اور قصہ سناتے ہوئے حضور ﷺ کی شفقتوں کا ذکر فرمایا:

عزیزم قاسم!

اس مرتبہ میں جب انگلینڈ گیا تو وہاں مانچسٹر میں ایک گھر میں محفل ذکر تھی۔ دعا کرنے لگا تو ذہن میں یہ بات القا ہوئی کہ ساتھیوں کو عاجزی کی تلقین کروں۔ دعا کے بعد عرض کی "اللہ کا بندہ زمین کی طرح ہوتا ہے جو سب کے لیے بچھی رہتی ہے۔ عاجز مسکین بن کر رہنا فضیلت مآب ہے۔

اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"یکون فی آخر الزمان زعیم القوم ارذلھم"

آخری زمانے میں قوم کا سردار وہی ہوگا جو ان میں سب سے کم تر ہوگا۔
ممکن ہے اس ارشاد میں اشارہ عاجزی کے ساتھ رہنے والوں کی طرف ہو۔

میں نے اتنی بات کی ہی تھی کہ ایک شخص نے روتے ہوئے کہا۔ حضور آپ سید ہیں آل نبی ہیں۔ میں قادیانیوں کا ڈسا ہوا ایک شخص ہوں جو یہاں انگلینڈ میں ذلیل ہو رہا ہوں حکومت نے مجھے دس دنوں میں یہاں سے نکلنے کا حکم دے دیا ہے۔ ہوم آفس نے اپیل نامنظور کر دی ہے۔ اب ہمارے وکیل آپ ہی ہیں۔ ٹکٹ میں پیش کرتا ہوں اپنے نانا کے حضور مدینہ تشریف لے جائیں اور ہماری عرضی پیش کریں۔ سوائے حضور ﷺ کے کوئی ہمارا وسیلہ نہیں۔ دن صرف نو رہ گئے ہیں۔

عزیزم قاسم!

"میں جان نہ سکا کہ مجھ سے یہ غلطی کیوں ہو گئی کہ میں نے ٹکٹ لیا ویزا پہلے سے تھا اور حرمین شریفین حاضری دینے کے لیے روانہ ہو

گیا۔ اب جو حضور ﷺ کی دہلیز پہ حاضر ہوا تو عرض کی "یارسول اللہ ﷺ مجھ سے غلطی ہوگئی میں گناہ کر بیٹھا آپ کے حضور حاضری کا ٹکٹ لے کر آ گیا۔ مجھے اعتراف ہے یہ رشوت ہے میں مانتا ہوں مجھ سے ذلت ہوئی۔ حضور ﷺ آپ کے دشمنوں نے ایک سادہ لوح مسلمان کو پھنسا کر مانچسٹر کا قیدی بنا دیا۔ حضور ﷺ حکم اگر بدلوا دیں تو ایک قوم کا ایمانی فائدہ ہو جائے گا"۔

مدینہ شریف کے معروف ہوٹل "المبرورہ" میں حاضری کے بعد واپسی ہوئی تو شہر نور میں حاضری کا مزا اپنی جگہ لیکن طبیعت بے چین سی رہی۔ تین دن بعد انگلینڈ سے خوشی کا فون سنا کہ ہوم آفس نے خط لکھا ہے کہ ہم اپنا پہلا حکم واپس لیتے ہیں اور انگلینڈ میں آپ کے لیے ایک با عزت شہری کی حیثیت سے رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ شاہ جی یقیناً یہ کام حضور ﷺ نے ہی کروایا ہے۔

شاہ جی کہتے ہیں میں دوبارہ دہلیز نور پر حاضر ہوا اور صلوٰۃ وسلام عرض کر لینے کے بعد زور زور سے تشکر آمیز لہجے میں عرض گذار ہوا:

"حضور ﷺ مہربانی! دوبارہ ایسی خطا نہ ہوگی مجھے معلوم ہے ہر حالت میں اللہ کی رضا میں راضی رہنا ہی عظمت ہے لیکن اللہ سے مانگنا التجا کرنا اور اس کے سامنے جھولی پھیلائے رکھنا عبادت کی جان ہے اور یہ سب کچھ اللہ کی توفیق ہی سے ممکن ہے۔

قارئین!!

پیٹ پر ہاتھ رکھ کر صحت کے لیے دعا لکھ رہا ہوں آپ آمین کہہ دیں اور یہ دعا بھی فرما دیں کہ شاہ جی سے محبت پیٹ سے ہاتھ سرکا کر دل تک پہنچا دے اور اللہ اپنا سچا عشق اور بندگی نصیب فرمائے۔

اگلی حاضری تک کے لیے رخصت۔

☆☆☆

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

علامہ محمد دین سیالوی ارض وطن کے معروف عالم دین ہیں اس وقت انگلینڈ کے مشہور شہر نیلسن میں دین مبین کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے دانش حجاز کے نام سے انبیاء، صلحا اور دانشوران ملت کے ایمان افروز اقوال اکٹھے کیے ہیں۔ سبق آموز اقوال پر ان کے زرین اور بامعنی تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زبان حال سے کہی ہوئی باتیں قارئین وکیل راہ کی نذر کی جاتی ہیں۔ (چوتھا حصہ)

محمد دین سیالوی

73 العقلاء ثلاثة

قال یحیی بن معاذ علیہ الرحمة العقلاء ثلاثة :

الاول: من ترک الدنیا قبل ان تترکه .

والثانی: من بنیٰ قبره قبل ان یدخله .

والثالث: من ارضی ربه قبل ان یلقاه.

عقلمند تین ہیں

یحیٰی بن معاذ کہتے ہیں کہ عقلمند تین ہیں:

☆ جس نے دنیا کو چھوڑ دیا اس سے پہلے کہ دنیا اس کو چھوڑ دے۔

☆ جس نے اپنی قبر بنائی اس سے پہلے کہ اس میں داخل ہو۔

☆ جس نے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری سے پہلے اپنے رب کو راضی کر لیا، (ارشاد العباد صفحہ ۱۱)

تبصرہ

دنیا کو چھوڑنے کا مزا تب ہے کہ اسے عروج اور شباب پر چھوڑا جائے یعنی جب وہ پوری طرح مہربان ہو اس وقت اسے ٹھکرا دیا جائے جیسے حضرت ابراہیم بن ادھم علیہ الرحمۃ نے بلخ کی مملکت چھوڑ کر فقرا کا راستہ اختیار کیا اور جب دنیا خود ہی منہ موڑ لے اس وقت ہمارا چھوڑنا یا نہ چھوڑنا چہ معنیٰ وارد؟ کچھ لوگ پوری زندگی دنیا سے چمٹے رہتے ہیں اور مرنے لگتے ہیں تو اس وقت وصیت کرتے ہیں کہ ہمارے مال میں سے اتنا فلاں کو دے دینا اور اتنا فلاں کو، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ اب تو وہ وصیت بھی نہ کرتا تب بھی مال کسی کا ہو ہی جاتا۔

جزا و سزا کا اختیار اور ارادہ سے گہرا تعلق ہے، وہی عمل جزا کا حق دار ٹھہرے گا جو اختیار و ارادہ اور صدق نیت سے کیا جائے، جب انسان کسی کام کے کرنے پر مجبور ہو تو اس عمل کا کوئی فائدہ نہیں، ترک دنیا ہو یا اطاعت الٰہی یہ تب ہی قابل قبول ہوں گے جب اختیاری ہوں، اضطراری ہوں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لگاؤ تجھ میں نہ لاگ زاہد درد الفت کی آگ زاہد

پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا

74 : لاادری

سئل الشعبی علیہ الرحمة عن مسئلة، فقال: (لاادری) فقیل له :(فبای شیء تاخذ رزق السلطان) فقال: (لاقول لاادری لمالا ادری) وقیل له :(اما تستحی من کثرة ماتقول لاادری) فقال: (لکن الملائکة المقربین لم یستحیوا حین سئلو عما لایعلمون ان یقولو (لاعلم لنا الاما علمتنا انک انت العلیم الحکیم) (البقرة: ۳۲)

میں نہیں جانتا

امام شعبی علیہ الرحمۃ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا، انہوں نے کہا: (میں نہیں جانتا) انہیں کہا گیا: (پھر تم بادشاہ سے تنخواہ کس بات کی لیتے ہو)

انہوں نے کہا: (اس بات کی جو بات مجھے نہ آتی ہو اسکے بارے میں (کھلے لفظوں) میں کہہ دوں کہ میں نہیں جانتا۔

انہیں کہا گیا: (بار بار (میں نہیں جانتا) کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟)

انہوں نے کہا: (جب فرشتوں سے ایسی بات پوچھی گئی جس کا انہیں علم نہیں تھا تو انہوں نے (ہمارے پاس علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا اور تو ہی جاننے والا اور حکمت والا ہے) کہنے میں شرم محسوس نہیں کی (تو میں کیوں شرم محسوس کروں) (ارشاد العباد صفحہ ۱۲۷)

تبصرہ

امام شعبی علیہ الرحمۃ کی اس بات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ہم سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا ہمیں علم نہیں تو غلط سلط جواب دینے اور بات کا بتنگڑ بنانے کی بجائے ہمیں صرف کہہ دینا چاہیے کہ میں نہیں جانتا۔ یہ شرم کی بات نہیں بلکہ عظمت کی دلیل ہے۔ سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ''اگر کوئی چیز تمہیں معلوم نہ ہو تو جواب میں ''لا اعلم: میں نہیں جانتا'' کہہ دینا بھی آدھا علم ہے۔'' آج کل ایک فقرہ بہت مشہور ہو گیا ہے۔ ''مولوی آں باشد کے چپ نشود'' مولوی یعنی عالم دین وہ ہوتا ہے جو خاموش نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مولوی کو کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو وہ ہار نہیں مانتا اور کچھ نہ کچھ (چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو) بولتا رہتا ہے۔ علماء حقہ پر یہ بہت بڑی تہمت ہے، علماء سے بہتر بھلا کون

جانتا ہے کہ خاموشی حکمت و دانائی جبکہ فضول اور غلط گفتگو حماقت کی دلیل ہے۔ بہر حال تہمت لگانے والے بھی نرے جھوٹے نہیں، علماء کے ایک نام نہاد طبقہ نے یہ وطیرہ بنالیا ہے کہ مطالعہ کے قریب نہیں جاتے لیکن مفتی، شیخ الحدیث، اور شیخ القرآن کہلانے کا بڑا شوق ہے۔ بغیر تیاری گھنٹوں تقریر کرتے ہیں اور اسے بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، حقیقت میں وہ اپنا اور سامعین کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا احساس نہیں۔ اگر ایک خطیب جمعہ کی تقریر میں آدھا گھنٹہ فضول اور بے مقصد گفتگو کرتا ہے اور اس کے سامعین ایک ہزار ہیں تو اس نے آدھا گھنٹہ نہیں بلکہ قوم کے پانچ سو گھنٹے ضائع کئے ہیں۔

75 من احب شیأاکثر ذکرہ

ذکر اناس الدنیا واقبلوا علی ذمھا عند رابعۃ العدویۃ رحمھا اللہ،فقالت اسکتوا عن ذکرھا فلولا موقعھا من قلوبکم ما اکثرتم من ذکرھاان من احب شیأاکثر من ذکرہ.شعرا

الاانما الدنیا کجیف

جو جس چیز سے محبت کرتا ہے کثرت سے اس کا ذکر کرتا ہے

کچھ لوگوں نے حضرت رابعہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا کے پاس دنیا کی مذمت کی تو آپ نے فرمایا: خاموش ہو جاؤ اور دنیا کا ذکر نہ کرو، اگر دنیا تمہارے دلوں میں رچی بسی نہ ہوتی تو تم اتنی کثرت سے اس کا ذکر نہ کرتے کیونکہ (انسان کو) جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔

شعر کا ترجمہ:

دنیا مردہ لاش ہے۔ اور اس کے طالب غرانے والے کتوں کی مثل ہیں، لمبی لمبی ٹوپیوں اور (بڑے بڑے جبوں) والے دنیا کی سب سے زیادہ مذمت کرتے ہیں اور حقیقت میں وہی دنیا کے سب سے بڑے پجاری ہیں۔ (ارشاد العباد صفحہ ۱۱)

تبصرہ

حضرت رابعہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا کے اس فرمان میں ریاکار اور نمود و نمائش کے دلدادہ لوگوں پر تنقید ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو صوفیاء میں سے ظاہر کرتے ہیں۔ بات بات پر دنیا سے نفرت کا اظہار اور اس کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ وہ شدید قسم کے دنیا پرست ہوتے ہیں اور دنیا کا ذکر کر کے ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔ دنیا کا بار بار ذکر کرنا ہی بتاتا ہے کہ دل میں کچھ کالا کالا ہے وہ اس مصرع کا مصداق ہوتے ہیں۔

کام ہے ان کے ذکر سے، خیر وہ یوں ہوا کہ یوں

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تجربہ آپ کو آئے روز ہوتا ہے، کہ جو آدمی جس برائی میں مبتلا ہوتا ہے وہ بار بار اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے، اسے خوف ہوتا ہے کہ بے نقاب نہ ہو جائے، لہذا پردے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو آدمی جھوٹا ہے وہ بات بات پر کہے گا، میں نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا، میں تو سچی بات کرتا ہوں، قسمیں کھائے گا لیکن سچے آدمی کو اپنے کردار پر اعتماد ہوتا ہے، اسے اپنی صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

76۔ ان الشیطان یخاف من شعاع شمس المعرفۃ ولا من العصا.

ان أبا سعید خراز علیہ الرحمۃ رأی ابلیس فی المنام فأراد أن یضربہ بالعصافقال: یا أبا سعید أنالا أخاف من العصا وانما أخاف من شعاع شمس المعرفۃ اذا طلعت من سماء قلب العارف

شیطان آفتاب معرفت کی شعاع سے ڈرتا ہے ڈنڈے سے نہیں

ابو سعید خراز علیہ الرحمتہ نے شیطان کو خواب میں دیکھا اور اسے ڈنڈے سے مارنے کا ارادہ فرمایا۔ شیطان نے کہا: (ابو سعید! میں ڈنڈے کی مار سے نہیں ڈرتا، ہاں آفتاب معرفت کی جو عارف ربانی کے قلب مبارک کے آسمان سے طلوع ہو) (روح البیان جلد اول صفحہ ۵)

77۔ المتصوفۃ الجاہلین

بعض المتصوفۃ من اھل زماننا یدعی ان شیخہ قطب الزمان یجب الاقتداء بہ علی کل مسلم حتیٰ ان من لم یکن من جملۃ مریدیہ کان کافرا،وان مات ،لم یمت مومنا.

جاہل صوفیاء

ہمارے زمانے میں بعض جاہل صوفیاء کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا شیخ قطب زماں ہے اور اس کی اقتداء ہر مسلمان پر واجب ہے حتیٰ کہ جو اس کا مرید

نہ ہوگا وہ کافر ہوگا اور اگر اسی حالت میں مر گیا تو مسلمان نہیں مرے گا۔ (روح البیان جلد نہم صفحہ ۴۸۳)

تبصرہ

صاحب روح البیان نے اپنے دور (گیارہویں صدی) کی بات کی ہے، ظاہر ہے مرور زمانہ کے ساتھ اس بدعت میں اضافہ ہو گیا ہے، ہمارے دور میں بے عمل پیروں کو قطب زماں، غوث العصر اور معلوم نہیں کیا کچھ کہا جا رہا ہے، جس کے بھی دو، اڑھائی مرید ہو جائیں وہی قبلہ عالم اور جنید ثانی کہلانے پر مصر ہے، ان قبلوں کی سواد اعظم میں وہ افتراک پیدا کی ہے کہ الامان والحفیظ، نہ علم ہے نہ عمل، نہ سیرت نہ کردار بس صرف جبہ اور دستار، عوام تو رہے ایک طرف بڑے بڑے خواص ان کے صید زبوں بنے ہوئے ہیں اور اپنے ایمان ان کی پیری کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں، اولیا، اور صوفیاء کی زندگیاں دعوت وعزیمت سے عبارت تھیں، اسلام ہمیں ان کی وساطت اور جہد وریاضت سے پہنچا تھا لیکن ان کے نااہل جانشینوں اور جھوٹے روپ دھارنے والے رہزنوں نے ان کی روشن تاریخ کو داغدار کر دیا۔

سر مست ہیں ظاہر میں، یہ باطن ہشیار
صوفی ہیں مگر عمل ہے ان کا تہہ دار
قوالی و نذرانہ و دعا و مجلس
ان چار عناصر سے ہوئے ہیں تیار

(پیر نصیر الدین نصیر)

78: تاثیر نیۃ الملک

یحکی ان انو شیر وان اتفطع فی الصید عن القوم فا نتھی الی بستان فقال لصبی فیہ: (اعطنی رمانۃ) فا عطاہ فا ستخرج من حبھا ما کثیر اسکن بہ عطشہ فا عجبہ واضمر اخذ البستان من مالکہ فسالہ اخریٰ فکانت عفصۃ قلیلۃ الماء فسال الصبی عنہ فقال: (لعل الملک عزم علی الظلم) فتاب قلبہ وسا لہ اخریٰ فوجدھا اطیب من اولی فقال الصبی: (لعل الملک تاب) فتنبہ انو شیر وان وتاب با لکلیۃ عن الظلم فبقیٰ اسمہ مخلد ا با العدل حتیٰ روی عن رسول اللہ انہ تفاخر فقال: (ولدت فی زمن الملک العادل)

بادشاہ کی نیت کا اثر

بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نوشیرواں شکار کے موقعہ پر قوم سے دور ایک باغ میں جا پہنچا۔ وہاں ایک بچہ بیٹھا تھا، اس نے اسے کہا: (مجھے ایک انار دو) لڑکے نے انار پیش کیا، بادشاہ نے اسے نچوڑا تو اس سے بہت زیادہ (اور میٹھا) پانی نکلا، جس کے پینے سے اس کی پیاس بجھ گئی۔ وہ بہت متعجب ہوا اور دل میں ٹھان لی کہ وہ یہ باغ اس کے مالک سے ضرور چھینے گا۔ لڑکے سے ایک اور انار مانگا (اس نے پیش کر دیا اس دفعہ بادشاہ نے انار نچوڑا تو) بہت کم اور ترش پانی نکلا۔ لڑکے سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: (معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کر لیا ہے) نوشیرواں نے یہ بات سنتے ہی دل میں (سچی) توبہ کی اور پھر انار مانگا۔ (لڑکے نے حاضر کر دیا اس دفعہ تو ڑا تو) پہلے سے بھی میٹھا اور لذیذ پایا۔ لڑکے نے کہا: (غالب امید ہے کہ بادشاہ نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور (ظلم سے) توبہ کر لی ہے) نوشیرواں اس راز سے آشنا ہو گیا (کہ بادشاہ کی بدنیتی سے ملک میں بے برکتی اور نحوست پھیل جاتی ہے۔ حتیٰ کے پھلوں میں رس بھی کم اور ترش ہو جاتا ہے)۔ اور آئندہ ظلم سے ہمیشہ کے لئے تہ دل سے توبہ کر لی، جس کی وجہ سے آج بھی اس کا نام عادل بادشاہ کے طور پر مشہور ہے (اور رہتی دنیا تک مشہور رہے گا) یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے فخر کے ساتھ یہ کلمات ارشاد فرمائے (میں عادل بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں)

(روح البیان جلد اول صفحہ ۱۶)

تبصرہ

حکمران کی نیت صاف نہ ہو تو ملک وقوم کے لیے بڑی محنت کرے تب بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور قوم کی قسمت پر پڑے قفل نہیں کھلتے لیکن حاکم کی نیت صاف ہو تو بغیر محنت ترقی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور ملک وقوم کو استحکام نصیب ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ مسلم دنیا اس وقت زوال کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ عوام بنیادی انسانی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ باطل استعمار اسے تہس نہس کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ مسلم حکمران بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں اور مختلف عناصر کو اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن یہ بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی بنیاد اور جڑ حکمرانوں کی بدنیتی ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو ذاتی مفاد

ملک وقوم سے زیادہ عزیز ہے اس کے لیے وہ سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے قوم وملک کو سانحات سے دوچار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہر لیڈر یہی سوچتا ہے کہ میں قوم کے لیے ناگزیر ہوں اور میں نہیں رہوں گا "خاکم بدہن" ملک اور قوم نہیں رہیں گے۔ عوام کی سوچ اس کے برعکس ہے ان کا خیال ہے کہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اور ہماری ملت کی کشتی کا سب سے بڑا بوجھ حکمران طبقہ ہے جب تک انہیں راستے سے ہٹایا نہیں جاتا یا یہ غرق نہیں ہو جاتے قوم ساحل مراد تک نہیں پہنچ سکتی۔ مسلم قوم کی موجودہ قیادت پر راہنمایان گم کردہ راہ کی پھبتی صادق آتی ہے وہ قوم کو ہر روز سبز باغ دکھاتے ہیں اور منزل کے نام پر ایک نئے سراب میں ڈال دیتے ہیں۔

فریب منزل مقصود دے گئے ہم کو
کہاں یہ راہنما کارواں کو لے آئے

79. الدنیا مجمع کلاب

الدنیا مزبلة ومجمع کلاب ،واقل من الکلاب من عکف علیها فان الکلب یا خذ من الجیفة حاجته وینصرف والمحب للدنیا لا یفارقها بحال.

دنیا کتوں کا مجمع ہے

دنیا کوڑے کرکٹ کا ڈھیر اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہیں، دنیا سے چمٹنے والا (محبت کرنے والا) کتوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ کتا مردار سے ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور چلا جاتا ہے لیکن دنیا کا پجاری اسے کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ (ارشاد العباد صفحہ ۱۲)

تبصرہ

احادیث میں بھی دنیا کو کوڑا کرکٹ اور دنیا پرستوں کو کتوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس سے مراد وہ دنیا ہے جو انسان سے انسانیت چھین لیتی ہے اور اسے عیاش، آوارہ، لذت پرست، خود غرض، حرام خور، آدم بیزار اور خدا کا باغی بنا دیتی ہے۔ ورنہ یہی دنیا جب شریفوں کے ہاتھ لگتی ہے تو وہ اسے خدمت خلق اور رضائے الٰہی کے لئے خرچ کر کے جنت کی بہاریں خرید لیتے ہیں۔ دنیا کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ جیسے جیسے دنیا بڑھتی جائے اس کی بھوک جواں ہوتی جاتی ہے، ہوا و ہوس کا یہ سلسلہ قبر میں ہی جا کر ختم ہوتا ہے۔

ادھی لعنت دنیا تائیں ،تے ساری دنیاں داراں ہو
جیں راہ صاحب تے خرچ نہ کیتی لین غضب دیاں ماراں ہو
پیواں کولوں پتر کوہاوے بھٹھ دنیاں مکاراں ہو
جنہاں ترک دنیاوی کیتی باہو، لیسن باغ بہاراں ہو
دنیا ڈھونڈ ن والے کتے دردر پھرن حیرانی ہو
ہڈی اتے ہوڑ تنہا ں دی لڑدیاں عمر وہانی ہو
عقل دے کو تاہ سمجھ نہ جانن پیون لوڑن پانی ہو
باجھوں ذکر ربے دے باہو کوری رام کہانی ہو

(حضرت سلطان باہوؒ)

80: اقامة الصلوٰة بادابها الظاهرة والباطنة

ذکر ان حاتما الزاهد علیه الرحمة دخل علی عاصم بن یوسف علیه الرحمة فقال له عاصم (یاحاتم هل تحسن ان تصلی؟) فقال: (نعم) قال: (کیف تصلی؟) قال: (اذا تقارب وقت الصلوة اسبغ الوضوء ثم استوٰی فی الموضع الذی اصلی فیه

حتیٰ یستقر کل عضو منی واریٰ الکعبة بین حاجبی والمقام بحیال صدری والله فوقی یعلم ما فی قلبی وکان قدمی علیٰ الصراط والجنة عن یمینی والنار عن شمالی وملک الموت خلفی وأظن انها آخر الصلوٰة .ثم اکبر تکبیرا حسان واقرأ قرأة بتفکر وارکع رکوعا با التواضع واسجد سجوداً با التضرع ثم اجلس علی التمام واتشهد علی الرجاء وأسلم علی السنة ثم أسلمها للاخلاص واقوم بین الخوف والرجاء ثم اتعاهد علی الصبر) قال عاصم: (یا حتم أهکذا صلاتک) قال: (کذا

صلاتی منذ ثلاثین سنة)فبکی عاصم وقال : (ماصلیت من صلاتی مثل ھذا قط)

ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ نماز کی ادائیگی

حاتم زاہد علیہ الرحمۃ عاصم بن یوسف علیہ الرحمۃ کے پاس تشریف لے گئے تو عاصم نے کہا: (اے حاتم! کیا تم نماز اچھی طرح ادا کرتے ہو؟) انہوں نے کہا: (ہاں) عاصم نے کہا: (وہ کیسے) حاتم نے جواب دیا: (جب نماز کا وقت قریب ہوتا ہے تو کامل (ظاہری اور باطنی) وضو کرتا ہو (ظاہری پانی سے اور باطنی توجہ سے)اور نماز پڑھنے کی جگہ اطمینان اور سکون سے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ نماز کی ادائیگی میں یہ خیال کرتا ہوں کہ گویا کعبہ میرے دوابرو کے درمیان ہے اور مقام ابراہیم میرے سینے کے سامنے ہے، میرا مالک میرے سینے کو ملاحظہ فرما رہا ہے۔ میرا قدم پل صراط پر، جنت میرے دائیں، دوزخ میرے بائیں اور ملک الموت میرے پیچھے ہیں اور یہی تصور ہوتا ہے کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر احسان کے ساتھ تکبیر کہتا ہوں، تدبر و تفکر کے ساتھ قرأت کرتا ہوں، عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں، خشوع و خضوع سے سجدہ کرتا ہوں۔ آخر میں قعدہ کرتا ہوں، رجاء کے ساتھ تشہد پڑھتا ہوں، ایک سلام سنت پر اور دوسرا اخلاص پر پھیرتا ہوں اور صبر پر پابند رہتا ہوں) عاصم نے کہا: (اے حاتم تم ایسے نماز پڑھتے ہوں؟) حاتم نے کہا: (ہاں ایسے پڑھتا ہوں) اور (ایک دو دن سے نہیں) تیس سال سے ایسے پڑھ رہا ہوں) عاصم رو پڑے اور کہنے لگے: (ہائے افسوس! میں کبھی بھی ایسی نماز نہیں پڑھ سکا) (روح البیان صفحہ ۳۳)

☆☆☆ باقی آئندہ ☆☆☆

دینی مسائل اور ان کا حل

"مسائل دین و دنیا" کے عنوان کے تحت قارئین کرام کے ان سوالات کے جوابات قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں جو کارزار حیات میں مختلف اعمال و افعال کی بجا آوری کے دوران انسانی ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور پھر ذہنی و روحانی الجھنوں کا باعث بنتے ہیں۔ آپ کو بھی کوئی الجھن درپیش ہو یا ذہن کے نہاں خانے میں کوئی سوال پیدا ہو کر پریشان کر رہا ہو تو فوراً لکھیے۔ آپ کو انشاء اللہ تعالیٰ اس سوال کا شافی و کافی جواب دیا جائے گا۔

محمد لیاقت علی مفتی

سوال:۔ایک عورت کے اپنے بچے نہیں ہیں کیا وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی سے بچوں کے ساتھ حج پر جا سکتی ہے؟

جواب:۔قرآن مجید نے باپ کی منکوحہ کو اولاد کے لئے محرم قرار دیتے ہوئے اس کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے "ولا تنکحوا ما نکح اٰبائکم" اور نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے لہٰذا وہ عورت اپنے شوہر کے مذکورہ بچوں کے ساتھ حج کے لئے جا سکتی ہے،اس لیے کہ وہ اس کے لیے اس کی اپنی اولاد کے درجے میں ہیں۔

سوال:۔حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لینے کے بعد کن امور سے اجتناب لازم ہے؟اور اگر کوئی ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے تو اس کا ازالہ کیسے کر سکتا ہے؟

جواب:۔احرام باندھنے والے کو محرم کہا جاتا ہے اور محرم کے لئے دوران احرام بہت سے ایسے امور حرام یا مکروہ ہو جاتے ہیں جو ایک عام آدمی کے لئے حلال ہوتے ہیں۔اگر کوئی محرم ان کا ارتکاب کر لے تو بعض امور میں دو دم اور بعض امور میں ایک دم لازم ہوتا ہے۔بعض میں صدقہ اور بعض میں صرف توبہ استغفار ہے۔جن امور کے ارتکاب سے دم لازم آتا ہے وہ یہ ہیں:

1۔ اپنے پورے عضو مثلاً سر یا چہرہ وغیرہ کو خوشبو لگانا،خوشبودار تیل یا لوشن وغیرہ کے استعمال کا بھی یہی حکم ہے۔

2۔ اگر کسی نے اپنے سر کو مہندی لگائی اور مہندی بھی اتنی کہ اس کے پورے سر کے بال جم گئے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے سر ڈھانپ لیا ہو تو اس صورت میں اس پر دو دم لازم ہوں گے۔ایک خوشبو کی وجہ سے اور دوسرا سر ڈھک جانے کے باعث بشرطیکہ پورا دن مہندی رہی ہو ورنہ ایک دم لازم ہوگا۔مہندی کے خوشبو ہونے سے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے جو آپ علیہ السلام نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا "ولا تمسی الحناء فانه طیب" "اور مہندی کو چھونا بھی نہ اس لئے کہ یہ بھی خوشبو ہے" یاد رہے کہ حالت احرام میں وسمہ یا خضاب لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے نہ تو بال جمتے ہیں اور نہ ہی وہ خوشبو ہے البتہ اگر اس سے بھی بال ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو اجتناب ہی بہتر ہوگا۔

3۔ سلا ہوا کپڑا پہننا

4۔ پورے دن تک اپنے سر کو ڈھانپے رکھنا

5۔ بال کاٹنا یا منڈوانا

6۔ شکار کرنا

7۔ ناخن کٹوانا

8۔ بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا

جن امور میں صدقہ واجب ہے وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ پورے عضو سے کم میں خوشبو استعمال کرنا

2۔ پورے دن سے کم وقت کے لئے سلا کپڑا پہننا

3۔ کامل دن سے کم وقت کے لئے سر ڈھانپنا

4۔ چوتھائی سر سے کم بال کاٹنا

5۔ کسی دوسرے کا سر مونڈنا یا بال کاٹنا چاہے اس کے کہنے پر ایسا کیا یا بغیر کہے۔

6۔ اگر چار یا چار سے کم انگلیوں کے ناخن کاٹے تو ہر ناخن کے بدلے ایک صدقہ واجب ہوگا۔

علاوہ ازیں حالت احرام میں ہر قسم کے گناہوں سے بچنا لڑائی جھگڑے سے اجتناب اور سگریٹ نوشی وغیرہ سے بھی احتیاط لازم ہے۔

سوال:۔اگر گھر کا سربراہ قربانی دے دے تو کیا سب گھر والوں کی طرف سے ہو جائے گی یا سب کی جانب سے الگ الگ قربانی کرنا ہوگی؟

جواب:۔قربانی ہر آزاد مسلمان جو مالک نصاب ہو اس پر واجب ہوتی ہے۔احناف کے ہاں ظاہر روایت کے مطابق گھر کا سربراہ چھوٹے نابالغ بچوں کی طرف سے قربانی نہیں کرے گا بلکہ صرف اپنی طرف سے قربانی کرے گا۔ہاں اگر گھر کے افراد میں سے دیگر افراد بھی ذاتی طور پر نصاب کی ملکیت رکھتے ہوں تو ان پر الگ سے قربانی واجب ہوگی۔سربراہ کی قربانی انہیں کفایت نہیں کرے گی۔اگر گھر کے چھوٹے بچے بھی الگ سے مالک نصاب ہوں تو ان کی طرف سے قربانی انہی کے مال سے ان کا والد یا جس کو وہ کہیں وہی کرے گا۔ہدایہ شریف کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔"وان کان للصغیر مال یضحی عنه ابوه او وصیه من ماله" اور اگر چھوٹا بچہ صاحب مال ہو تو اس کی طرف سے اس کا والد یا وصی اسی کے مال سے قربانی کریں گے۔

سوال:۔ آج کل اکثر لوگ اجتماعی قربانی میں حصہ ڈالتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کسی جانور میں آٹھ حصے دار ہوں اور جانور ذبح کر دیا گیا تو کیا شرعی حکم ہے یا اگر سات میں سے کسی ایک نے آدھا حصہ ڈالا تو حکم مسئلہ کیا ہوگا؟

جواب:۔ قربانی اگر گائے، بیل یا اونٹ کی کی جائے تو اس میں سات حصے دار شریک ہوتے ہیں سات سے زیادہ حصہ دار ہوں تو قربانی جائز نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ میں چونکہ جانور کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے لہٰذا کسی ایک کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔ وجہ یہ کہ سات سے زائد حصے دار نہیں ہو سکتے اور آٹھ میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی بھی کوئی وجہ نہیں لہٰذا وہ نفل ہو جائے گی اور قربانی ہنوز سب کے ذمہ باقی رہے گی۔ دوسری صورت میں بھی قربانی کسی کی طرف سے نہ ہوگی کیونکہ قربانی میں آدھے حصے کا تصور نہیں ہر ایک کا حصہ پورا ہوگا تو قربانی ہوگی ورنہ نہیں۔ "ولا تجوز عن ثمانية اخذا بالقياس فيما لا نص فيه وكذا اذا كان نصيب احدهم اقل من السبع لا يجوز عن الكل لانعدام وصف القربة في البعض" (ھدایہ) اور قربانی آٹھ کی طرف سے جائز نہ ہوگی نص نہ ہونے کی وجہ سے قیاس پر عمل کرتے ہوئے اور اسی طرح اگر کسی ایک شریک کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہوا تو قربانی کسی طرف سے بھی نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں وصف قربت بعض افراد میں نہیں پایا گیا"۔

سوال:۔ ذوالحج کا مہینہ شروع ہونے کے بعد ہمارے ہاں لوگ ناخن وغیرہ تراشنے سے اجتناب برتتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۔ جو لوگ قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لئے قربانی کے آداب یہی ہیں کہ وہ ماہ ذوالحج میں قربانی کر لینے سے پہلے تک بال یا ناخن وغیرہ نہ کٹوائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "من اراد ان يضحي منكم فلا ياخذ من شعره واظفاره شيئا" اور جو تم میں سے قربانی کا ارادہ رکھتا ہو وہ بال یا ناخن نہ کاٹے" حدیث میں چونکہ ارادۂ قربانی کی تخصیص ہے لہٰذا وہ لوگ جو قربانی نہیں کرنا چاہتے ان کے لئے بال وغیرہ کاٹنے کی اجازت ہے۔

سوال: ہمارے ایک عزیز نے شادی کی اللہ نے اسے پانچ بیٹیاں عطا کیں مگر وہ اولاد نرینہ سے محروم ہے۔ دوسری شادی کے لئے اسے اپنی بیوی کی بھتیجی کا رشتہ مل رہا ہے کیا وہ اس سے شادی کر سکتا ہے؟ (شوکت علی شیخوپورہ)

جواب: دو عورتوں کے ایک مرد کے نکاح میں جمع ہونے سے متعلق فقہاء کرام نے ضابطہ بیان کیا ہے کہ ان دونوں سے کسی ایک کو مرد فرض کر کے دیکھا جائے کیا ان کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں، اگر تو آپس میں ان کا نکاح جائز ہوتا ہو تو وہ دونوں بیک وقت کسی ایک مرد کے نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو ان دونوں کو ایک ہی نکاح میں جمع کرنا حرام ہوگا۔ اس کی اصل محرمات والی آیت میں "وان تجمع بين الاختين" کے الفاظ ہیں۔ صورت مسئولہ میں بھی چونکہ اس قاعدے کے اطلاق سے چچا بھتیجی یا پھوپھی بھتیجی کا نکاح جائز نہیں ہوتا لہٰذا پھوپھی بھتیجی بیک وقت کسی ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اور ایسا کرنے والا حرام کام کا مرتکب ہوگا۔

سوال: ایک عورت کی اپنے خاوند کے ہمراہ حج کے لئے درخواست منظور ہوئی مگر روانگی سے 20 دن قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ کیا وہ عورت عدت کے دوران اپنے بیٹے کے ہمراہ حج کے لئے جا سکتی ہے؟ (عامر عثمان، راولپنڈی)

جواب: صورت مسئولہ میں شرعی حدود و قیود کے مطابق اس عورت کے لئے اپنے خاوند کے گھر میں ہی عدت گزارنا لازم ہے۔ وہ عدت کے دوران سفر حج کے لئے نہیں جا سکتی۔

سوال: میرا میری بیوی کے ساتھ بچوں کے رشتے پر اختلاف ہوا میں نے اسے ابوظہبی سے بذریعہ کیسٹ ایک طلاق دی اور دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو مزید طلاق بھی دے سکتا ہوں۔ نو ماہ بعد میں پاکستان آیا، بیوی کے رویے میں تبدیلی نہ آنے کے باعث میں نے دوسری اور پھر واپس جاتے ہوئے تیسری طلاق بھی دے دی۔ اس بارے حکم شرعی کیا ہے؟ (عبدالرشید، راولپنڈی)

جواب: پہلی طلاق رجعی ہوتی ہے۔ اگر مرد چاہے تو وہ بیوی سے دوران عدت رجوع کر سکتا ہے۔ رجوع کرنے کی صورت میں بلا نکاح جدید وہ بدستور میاں بیوی ہی رہتے ہیں، البتہ ایک طلاق کا حق استعمال کر لینے کی وجہ سے وہ باقی دو کا ہی مالک رہتا ہے، لیکن اگر رجوع نہ کیا ہو اور مدت گزر جائے تو وہ پہلی طلاق رجعی نہیں رہتی، بائن ہو جاتی ہے۔ دونوں کا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ صورت مذکورہ میں بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ آپ نے اپنی بیوی کو پہلی طلاق کے بعد نو ماہ گذار دیئے رجوع نہ کیا جس کے باعث آپ کا نکاح ختم ہو گیا تھا۔ بعد کی دو طلاقوں کے وقت وہ عورت آپ کی بیوی ہی نہ تھی لہٰذا محل طلاق نہ ہونے کے باعث وہ دو طلاقیں لغو ہو گئیں۔ اب اگر آپ دوبارہ اکٹھے رہنا چاہیں تو نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کے ذریعے ایسا کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

خوفناک حقائق بقلم خود

ڈاکٹر عبدالقدیر خان جوہری توانائی کی سراغ رسانی سے بند پنجرے تک کیسے پہنچے

عزت مآب جسٹس سردار محمد اسلم صاحب
السلام علیکم
اللہ تعالیٰ آپ کو اہل وعیال کو عزیز واقارب کو تندرست، خوش وخرم رکھے۔ حفظ وامان میں رکھے، عمر دراز کرے اور ہر مخلوق کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین
آپ کی اجازت سے آپ کی خدمت میں چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یکم فروری 2004 سے مجھے نمک حرام، احسان فراموش ڈکٹیٹر نے جھوٹے وعدے کر کے اور قوم اور ملک کی سلامتی کا واسطہ دے کر مجھ سے نام نہاد "اقرار جرم" کرایا اور وعدہ کیا تھا کہ میں ہیرو رہوں گا۔ پوری طرح بحالی ہوگی اور ملک کے اندر کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی لیکن 4 فروری کو ٹی وی پر میرے بیان پڑھنے کے بعد (جو SPD نے تیار کر کے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا) مجھے فوراً گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور بار بار یہ کہا گیا کہ یہ امریکہ کو بتانے کے لئے کیا ہے اور تین چار ماہ بعد مکمل آزادی ہوگی۔ یہ تین چار ماہ ساڑھے چار سال سے زیادہ میں تبدیل ہو گئے اور مشرف نے وقت کے ساتھ ساتھ تمام سرکاری اور خرید کردہ ذرائع استعمال کرنے اور میری کردار کشی کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ میرا اللہ رب العزت پر پورا اعتقاد تھا کہ کیونکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا اور جنرلوں کی ہدایات پر ہی عمل کیا تھا اللہ تعالیٰ ضرور اس کو ذلیل وخوار کرے گا اور یہ اس ملک میں کبھی سڑک پر نہ نکل سکے گا اور یہی ہوا۔ اللہ رب العزت نے مجھے پہلے سے کہیں زیادہ محبت اور عزت عطا فرمائی۔۔

محترم چیف جسٹس صاحب! آپ کی خدمت میں مؤدبانہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو کام مشرف قطعی غیر قانونی اور انسانی حقوق کے خلاف میرے ساتھ ساڑھے چار سال سے کر رہا تھا آپ کے بیرسٹر اقبال جعفری کی درخواست پر فیصلہ نے ایک قانونی حیثیت دے دی۔ آپ کے فیصلہ کے بعد میری ہر درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی جاتی ہے کہ یہ سیکورٹی رسک ہے۔ ایک روز میری درخواست پر جمعہ کی نماز کو اپنی E-7 کی مسجد (جو کہ میں نے خود تعمیر کرائی تھی اور جہاں میں 25 سال سے نماز ادا کر رہا تھا) کی بجائے جنرل ایوب کالونی لے گئے جہاں میں گرمی سے بیہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک گھر سے 200 گز دور مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح نہ ہی مجھے پاکستان اکیڈمی آف سائنسز اور نہ ہی میرے قیام کردہ فلاحی ادارے سا شے (Sachet) میں جانے دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں اور خود آنے کی دعوت دیتا ہوں، ان کے بارے میں ہفتوں جواب نہیں ملتا۔ پہلے یہ لوگ مجھ سے کچھ خوفزدہ رہتے تھے آپ کے فیصلے نے اور خاص کر آپ کا یہ جملہ subject to Security clearance میرے سر پر ایک تلوار بنا کر لٹکا دی گئی ہے اور خنجر کی طرح میرے حلق پر رکھ دیا ہے، آپ نے ان کو میرے اوپر مکمل اختیار دے دیا ہے اگر آپ مجھے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دیتے تو میرے ساتھ یہ نمک حرامی اور احسان فراموشی نہ کرتے۔ سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ یہ رویہ وہ نمک حرام اور احسان فراموش کر رہے ہیں جن کو میرے کام کا سب سے زیادہ فائدہ پہنچا اور جس نے ان کو سر اٹھانے کی قوت دی، ورنہ دسمبر 1971 کا حال سب سے عیاں ہے۔

محترم چیف جسٹس صاحب مجھے اور میری بیگم کو بہت تعجب ہوا تھا اور بہت دکھ ہے کہ میری بیگم کے دو خطوط میں جو واقعات بیان کئے گئے وہ فیصلے میں بالکل نظر انداز کر دیئے گئے سب سے بڑا سوال جو اٹھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ سرکاری وکیل وہ حکم پیش کرے، جس کے تحت مجھے نظر بند کیا گیا تھا اور لاتعداد تکالیف کا شکار بنایا گیا تھا۔ آپ نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا اور یہ تو تسلیم کر لیا کہ میں نظر بند تھا مگر وہ حکم نامہ یا قانون نہیں پوچھا جس کے تحت تمام وعدوں کے خلاف میرے ساتھ یہ احسان فراموشی کی گئی آپ کو علم ہے کہ میں نے اس ملک کے لئے وہ ناقابل مثال اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، میں بھٹو صاحب کے کہنے پر تین ہزار روپے تنخواہ مفت مکان اور لاتعداد دوسری سہولتیں چھوڑ کر پاکستان آیا اور تین ہزار روپے کی تنخواہ پر کام کیا، پہلی تنخواہ چھ ماہ بعد ملی تھی اور نہایت غیر آباد علاقہ F-8 میں مکان دیا گیا تھا، میری بیوی جو ڈچ نژاد ہے وہ اپنے ضعیف والدین کو چھوڑ کر میرے ساتھ آگئی اور ایک ستون کی طرح مجھے سہارا دیا جو لوگ اس کو جانتے ہیں وہ بلا جھجک کہتے ہیں کہ یہ پاکستانی بیویوں سے ہزار درجہ زیادہ پاکستانی ہے۔ اس دوران جو ذہنی تکالیف اس نے اٹھائی ہیں وہ کسی بھی بے غیرت کو شرمندہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آپ نے اس کی درخواستوں اور ان تمام غیر قانونی شرارتوں کو بھی بالکل نظر انداز کر دیا ہم دونوں کو بے حد دکھ ہے۔

اہم نوٹ
عزت مآب السلام علیکم
جناب عالی

حکومت کی بہانہ تراشی کہ یہ سب کچھ میری سیکورٹی کی وجہ سے کیا جارہا ہے۔ایک نہایت سستی بکواس اور سفید جھوٹ ہے۔1979ء سے پوری دنیا کو علم تھا کہ میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا انچارج ہوں، اس وقت حکومت کو میری فکر نہ تھی میں ہر ماہ لندن پیرس، بون، ایمسٹرڈم، زیورچ، استنبول، دمشق، وغیرہ جایا کرتا تھا اور کھلے عام جایا کرتا تھا۔اس وقت مجھے کسی نے نہ مارا اور نہ مارنے کی کوشش کی، اب جب کہ بم بنائے ہوئے پچیس سال ہوگئے ہیں اور ٹیسٹ کئے دس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں اور کہوٹہ سے علیحدہ ہوئے ساڑھے سات سال ہوگئے ہیں، تو ان کو میری حفاظت کی فکر ہوگئی ہے۔ یہ منافق ہیں اور نمک حرام اور احسان فراموش۔ دوئم میں نہ ہی کہیں مارا مارا پھرتا اور نہ ہی کہیں اپنے آپ کو کبھی خطرہ کی حالت میں لاتا ہوں اور خود سخت احتیاط کرتا ہوں، پوری قوم 99فی صد مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعد وہ میری محافظ ہے، یہ لوگ کسی کی کیا حفاظت کریں گے جب کہ ان کی ناک کے سامنے خودکش حملے اور قتل عام ہوتا ہے آپ براہ خدا ان کی اس ناپاک سازش کے دھوکہ میں نہ آئیں، کہوٹہ کی عدلیہ اور بار کے لئے میں نے جو کچھ کیا ہے آپ یقیناً اس سے واقف ہیں۔

☆☆☆